ISSN 0974-7346

ستمبر ۲۰۲۵ء

جلد ۲۱۲ — عدد ۹

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہیے۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اورنشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام:Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر:4761005500000051

آئی ایف ایس سی:PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ ماہ ربیع الاول ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۲۵ء عدد ۹

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.or

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۲
مقالات		
بائبل اور قرآن مجید میں آدمؑ اور حوّا کے بیانیے: ایک موازنہ	پروفیسر عبد الرحیم قدوائی	۵
حسرت موہانی کی ڈائری کے چند اوراق	پروفیسر فرانسس رابنسن	۲۲
مثنوی "سیف الملوک وبدیع الجمال" کا ادبی و تہذیبی مطالعہ	آصف مبین	۳۶
مغل خواتین اور فنون لطیفہ	طوبیٰ ادریس	۴۹
آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا ساٹھ سالہ سفر	سہیل انجم	۶۱
وفیات		
آہ! مولانا ثناء اللہ عمری مرحوم	محمد عمیر الصدیق ندوی	۶۸
تبصرۂ کتب	ع۔ص، ک۔ص۔اصلاحی	۷۲
ادبیات		
نظم (سہولت کے لیے)	خالد ندیم	۷۹
رسید کتب موصولہ		۸۰

شذرات

خلافت اسلامیہ کے نام سے مسلمانوں کی متحدہ قومیت کو پارہ پارہ کرنے میں قومیتوں خصوصاً عرب قومیت کا نشہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ یورپ کے جدید استعماری ہتھیاروں میں قومیت کا یہ ہتھیار دوسرے تمام قدیم و جدید اسلحوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوا۔ سو سوا سو سال پہلے اس کا ایک استعمال فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کی شکل میں ہوا، اس وقت عرب قومیت کے جوش میں عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹنے کی آواز کس کو سنائی دیتی۔ کون اس حقیقت پر کان دھرتا کہ زوال دولتِ عثمان، زوال شرع وملت ہے۔ پیشین گوئی کی اس سچائی پر کون ایمان لاتا کہ غبارِ کفر کی بے محابا شوخیاں اور دست درازیاں ایک نہ ایک دن دامان حرم کو بھی چھو سکتی ہیں۔ پیشین گوئیوں کا اعتبار قلب و نظر کی بلندیوں اور گہرائیوں ہی کے حوالے سے کیا جاسکتا ہے۔ آج غزہ کی تباہی اور بربادی نے بھوک، قحط، بیماری اور پھر نسل کشی کے بعد جس طرح نئے نقشوں کے ذریعے صدیوں کے بغض وعداوت کو مجسم کر دیا ہے، اس میں سامان عبرت یہی ہے کہ قوم وملت کو اپنے روشن ضمیر اور دور بیں اور دور اندیش دماغوں اور ذہنوں کی فکر اور بصیرت پر اعتماد اور یقین نہ کرنے کا ملال و نقصان اٹھانا ہی پڑتا ہے۔

***

غزہ اور فلسطین ہی کیا، ملت کی عالم گیری نے بغض وعداوت اور زیادہ واضح تعبیر میں طاغوت کے جذبۂ انتقام کو جیسے ہر جگہ بقول علامہ شبلی جلوہ گہ امتحان بنا دیا ہے۔ خصوصاً ملک عزیز میں عجب عالم بپا ہے۔ مسجدوں، مقبروں، مزاروں کو جو ماضی کی علامتیں ہیں ان کے انہدام کے ساتھ زندہ بستیوں کو اجاڑنے اور محض ایک مذہب کی شناخت رکھنے پر قانون کے نام پر ان کو بے گھر اور بے وطن کرنے کا جیسے کوئی ملکی پیمانہ پر مقابلہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہی نہیں شہری ہونے کے ثبوتوں کو غلط بتا کر شہریت کے حق ہی سے محروم کرنے کی حکمت عملی ہی گویا حکومت کا واحد فریضہ رہ گیا ہے اور اب قومیت کے نام پر اکثریت کی بالادستی چاہنے والوں کے لیے جمہوریت بھی ایک ایسی مشکل شے بن گئی جس کو دور کرنے میں۔ جمہوریت کے آداب و شرائط میں ملک کے دستور اور قانون پر کامل ایمان لانا شامل ہے، جس کا ثمرہ نظام عدل اور انتظام ریاست کی راست روی اور بنیادی اور ضروری انسانی حقوق کی آزادی اور حفاظت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لیکن اگر جمہوریت عوام کو تولنے کے بجائے صرف اعداد و شمار تک محدود کر دی جائے، تو پھر یہ محدودیت

کیسے یر غمالی شکل میں بدل جاتی ہے۔ اس کا اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔ یہ اور بات ہے کہ جن کے دلوں میں اخلاص اور جن کے سروں میں ملک و قوم کی خیر خواہی کا سودا ہے، ان پر حقیقت شروع ہی میں عیاں ہو جاتی ہے۔ آج ملک عزیز میں شور ہے کہ جمہوریت کی روح یعنی عمل انتخاب کا صحیح راستہ ہی نہیں بدلا گیا بلکہ اس کو گم کردہ راہ بنا کر جمہوری عمل ہی کو بے معنی کر دیا گیا۔ شور تو اب ہوا ہے، ورنہ اس حقیقت کا ادراک تو اسی وقت ہونا چاہیے تھا، جب جمہوریت کے جسم میں فسطائیت کے جراثیم نے اپنی جگہ بنانی شروع کی تھی۔ یہ ہمارے بزرگوں کی دور اندیشی کا کمال ہے کہ انہوں نے نصف صدی پہلے جب جمہوریت کے جسم میں نسلی آمریت کا سرطان اپنے پہلے ہی دور میں تھا، یہ آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ فسطائی جماعت یا اس جیسی کچھ اور جماعتوں کا نقطۂ نظر بالکل کھلا ہوا ہے۔ وہ سیکولرزم اور جمہوریت کو مانتی ہی نہیں ان کا نصب العین اکثریتی مذہبی حکومت کا قیام اور برہمنی تہذیب کا احیاء ہے۔ بظاہر اس کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان بنے، لیکن اس دشمنی کی وجہ یہی نہیں تھی بلکہ یہ تخریبی ذہن اپنے علاوہ کسی فرقہ، مذہب اور تہذیب کو برداشت ہی نہیں کرنے والا تھا۔ اسی بوسیدہ اور فرسودہ ذہنیت نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کو اچھوت بنایا، اسی نے بدھ مت کا خاتمہ کیا اور ہندوستان سے اس کا نام و نشان مٹا دیا۔ درحقیقت فرقہ پرستی اور اکثریتی آمریت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اس لیے ایک بڑی اقلیت ہی کیا، کم و بیش تمام اقلیتیں اس کا شکار ہیں اور ہوں گی۔ اس ذہنیت نے پہلے بھی ملک کو نقصان پہنچایا اور آئندہ بھی اس کو متحد اور مستحکم نہیں ہونے دے گی۔ یہ خیالات پچاس ساٹھ برس پہلے کے ہیں، جب کینسر پہلے اسٹیج میں تھا، لیکن تشخیص کمال کی تھی جس میں یہ بتایا گیا کہ اس مرض کے بڑھنے اور پھیلنے میں سب سے زیادہ قصور اس وقت کی حکمراں جماعت کا ہے۔ جب اس فتنے کو دبانے کا وقت تھا، اس وقت حکمراں سیکولر جماعت نے عوام میں مقبولیت اور حکومت کی طمع میں اس بیماری کو نظر انداز کیا، بلکہ پرورش بھی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس حکمراں پارٹی میں شرپسند طاقتوں نے اس طرح در اندازی کی کہ خود حکمراں جماعت ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ نصف صدی پہلے سیاست کی پرپیچ اور ہلاکت خیز راہوں سے بچ کر نکلنے والے ہمارے بزرگوں نے یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی کہ وہ دن دور نہیں جب یہ جمہوریت بلکہ انسانیت دشمن طاقتیں ریاستوں سے لے کر مرکزی حکومت تک پر قابض ہو جائیں گی اور ہندوستان سے سیکولرزم اور جمہوریت کا خاتمہ ہو گا اور پورا ملک انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جائے گا۔ اس وقت یہی کہا گیا تھا کہ یہ تنہا ایک بڑی اور مظلوم اقلیت کا مسئلہ

نہیں ہے بلکہ یہ جمہوریت اور ملک کے تحفظ وبقا کا مسئلہ ہے۔

***

یہ باتیں پرانی ہونے کے باوجود آج کے حالات کی حقیقت پہچاننے کے لیے وقت کی آواز ہیں اور پہلے سے زیادہ ضروری اور توجہ کے لائق ہیں۔ وقت نے یہ تو واضح اور ثابت کر دیا کہ فاشسٹ طریقہ کار جمہوریت کی حفاظت کرنے والے اداروں کو پہلے مفلوج کرتا ہے پھر جمہوریت ہی بے آسرا اور بے سہارا ہو کر بے مصرف اور بے نتیجہ بن جاتی ہے۔ آج ملک کی سیاسی زندگی میں ہلچل بلکہ بے چینی اور پریشانی اگر سب سے زیادہ جو سوال کرتی نظر آتی ہے وہ یہی کہ جمہوریت کا جسم بے جان کیوں ہوا؟ عزت آبرو، مال، دولت کے لٹنے اور ان پر شب خوں مارے جانے کے واقعات سے مانوس انسان اس سچائی پر یقین نہیں کر پاتا کہ اس کی رائے اور اس کی پسند بھی غارت گری کے دائرہ میں آجائے۔ ہمارے بڑوں نے اس برائی کے خاتمہ کے لیے نسخہ تجویز کیا تھا کہ جس طرح غیر ملکی غاصب و قابض حکمرانوں کے خلاف بے لوث اور ترقی پسند جماعتوں نے اشتراکِ عمل سے آزادی حاصل کی تھی، بس وہی نسخہ آج بھی کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی تاثیر میں شک بھی تھا کہ بعض ایسی جماعتوں کو حکومت کی چاٹ لگ چکی ہے اور یہ مشکل سے چھوٹتی ہے۔ اس لیے کامیابی کے لیے بہت کچھ قربان کر دینے کے جذبے کی ضرورت ہے۔ آج کے حالات میں حب الوطنی کے جذبات کی ترجمانی کے لیے ان احساسات کے علاوہ اور کیا چاہیے، یہاں ایک بات اور بھی دہرانے کا جی چاہتا ہے، آزادی وطن کے معاً بعد اس وقت کی حکمراں پارٹی کے بعض تنگ نظروں نے اکثریت کے جابرانہ حکم کو اقلیت کے لیے نافذ کرنے میں بابائے قوم کی آواز کو درکنار کر دیا اور سیکولر جماعت میں رہ کر فرقہ پرستی کی نیند میں صحیح سیاست و تدبر کا خون کرنے کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان ڈراؤنے خوابوں کے اثر سے نکلنے کے لیے کیا خوب فال نیک نکالا گیا کہ ”ہندوستان سے زیادہ کس کو یہ معلوم ہے کہ تاریخ کا باب ایک دن میں ختم نہیں ہو جاتا“۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ ۱۹۴۸ء کا یہ جملہ کاش اپنی معنویت کے ساتھ امیدوں کی سچائی کا نقیب بن جائے حالاں کہ مقطع میں کچھ لوگوں کے لیے سخن گسترانہ بات آہی گئی ہے کہ:

> ”کیا عجب ہے کہ کل کانگریس ہی کے اندر سے کوئی طاقت سچائی کی حمایت کے لیے کھڑی ہو جائے“۔

***

بائبل اور قرآن مجید میں آدمؑ اور حوّا کے بیانیے: ایک موازنہ

پروفیسر عبد الرحیم قدوائی
اعزازی ڈائرکٹر، نظامی مرکز علوم القرآن
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عین آغاز اسلام کے دور کے عیسائی مناظرہ باز عالم دین یحییٰ دمشقی (۶۷۵ء - ۷۴۹ء)[1] سے آج تک کے مغربی اسکالرز اور مستشرقین کا یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ قرآن مجید بائبل سے سرقہ یا محض اس کا ناقص چربہ ہے، اس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں اور یہ طباعی اور ابتکاریت سے عاری ہے۔ جزوی اختلاف ان فضلاء میں صرف اس امر پر رہا ہے کہ قرآن مجید یہودیت سے مستعار ہے یا عیسائیت سے۔ دونوں فریقین نے اپنے اپنے موقف کی تائید میں کتابوں اور مقالات کا ایک انبار لگار کھا ہے۔ ۱۹۷۸ء سے اس باب میں اس فتنہ پروری کا اضافہ ہوا ہے کہ صرف یہودی / عیسائی مذہبی روایات نہیں بلکہ قرآن مجید زرتشتی، اور مشرق اقصیٰ / مشرق قریب، بحیرہ روم کے ارد گرد پورے خطے کی دینی اسطوری، اور تہذیبی روایات کا مرکب بلکہ ملغوبہ ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس خطے سے مراد حجاز سے سیکڑوں میل پر واقع یہ دور دراز مقامات شامل ہیں: اسکندریہ، مصر، الجزائر، روم، لبنان اور لیبیا وغیرہ۔

طلسم ہوش ربا کا ایک منظر کہ ساتویں صدی (۶۱۰ء تا ۶۳۳ء) کے مکہ / مدینہ کے ان تمام مراکز سے مسافرت، علمی تحقیق اور تبادلۂ خیالات کے انتہائی برق رفتار وسائل رسول اکرمؐ کے قبضۂ قدرت میں تھے، آپؐ ان دور افتادہ ممالک کی تمام زبانوں پر دسترس رکھتے تھے، ان علاقوں کی روایات علماء اور فضلاء کے توسط سے آپؐ کو متواتر حاصل ہوتی رہتی تھیں اور ان کے مآخذ آپؐ کو دستیاب تھے

---

[1] عبد الرحیم قدوائی، "یحییٰ دمشقی: اولین عیسائی سیرۃ نگار" (زیر اشاعت)

اس مقالے میں عمداً "قصہ" کا مروجہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ "قصہ" سے ذہن بے ساختہ تخیل پر مبنی فن پارے کی طرف جاتا ہے جبکہ قرآن مجید کا ہر ہر لفظ اور حرف امر واقعہ پر مشتمل حقیقت ہے۔

جن سے آپؐ حسب ضرورت اخذ اور استفادہ کرتے اور ان پر مبنی مواد قرآن کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے یہاں تک کہ وہ ۶ ہزار سے زائد آیات پر مشتمل ایک جامع، مربوط اور ادبی اور فنی محاسن سے مملو عربی زبان میں قرآن مجید جیسا شاہکار پیش کرنے پر قادر ہو گئے[۲]۔

اس نا قابل اعتناء الزام کی تردید کے لئے یہ تاریخی حقائق کافی ہیں: رسول اکرمؐ امی (ناخواندہ) تھے، مکہ / مدینہ بلکہ پورے عالم عرب اور دنیا میں پڑھنے، لکھنے، کتابت اور طباعت کا رواج نہیں تھا۔ طباعت اور کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ ۱۴۴۰ء میں یعنی قرآن مجید کے نزول کے سات سو سال بعد شروع ہوا۔ اس سے قبل بعض خانقاہوں میں چند قلمی عبارتوں / مراسلوں کا سراغ ملتا ہے جن تک رسائی نہایت محدود تھی۔ عربی میں بائبل کا اولین ترجمہ قرآن مجید کے نزول کے ڈھائی سو سال بعد ہوا اور وہ بھی بالکل جزوی، جس میں زبور اور انجیل کے بہت قلیل تعداد میں اقتباسات ہیں۔ بائبل کا پہلا مکمل عربی ترجمہ ۱۶۷۱ء میں سرجیوس ریسی Sergius Risi کی نگرانی میں روم سے طبع ہوا۔

مذکورہ بالا پس منظر کے پیش نظر جبکہ رسول اکرمؐ کے بائبل کے مطالعے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، مکہ میں یہودی اور عیسائی مذہبی روایات کا کوئی وجود نہ تھا، قرآن مجید کے بائبل سے ماخوذ ہونے کا الزام محض خبث باطن کا آئینہ دار ہے اور اسلام / رسول اکرمؐ کو مطعون کرنے کی شر انگیزی کا مظہر ہے۔

مزید برآں بائبل اور قرآن مجید کے تقابلی مطالعے سے بھی اس الزام کی قلعی کھل جاتی ہے اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے، اس کے طبع زاد ہونے اور بائبل کے بالمقابل اس کی اخلاقی برتری اور اس کے منطقی اور استدلالی بیانیے کا معجزاتی حسن اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ ذیل میں آدمؑ

---

(۲) مستشرقین کی گم راہ کن آراء کے علمی تعاقب کے لیے ان کتب کا مطالعہ مفید ہو گا:
Muhammad Mustafa Al-Azmi, *The History of the Quranic Text*, Leicester, U.K. 2002
M.Mohar Ali, *The Quran and the Orientalists*, Norwich. U.K. 2004
۔ زریاب احمد فلاحی، قرآن مجید، مستشرقین اور مسلم فضلاء، علی گڑھ، کے-اے-نظامی مرکز علوم القرآن، ۲۰۲۴ء
۔ عبد الرحیم قدوائی، اسلام اہل مغرب کی نظر میں، علی گڑھ، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی ۲۰۲۳ء۔

اور حوا کے بائبل اور قرآن مجید میں بیانیے کا موازنہ نذر قارئین ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان دونوں صحیفوں میں کیا باہمی مناسبت اور کون سے بیّن اختلافات ہیں۔ ابتداء میں اس معروف امر کی صراحت البتہ ضروری ہے کہ چونکہ وحی الٰہی اصلاً بائبل اور قرآن مجید دونوں کا ماخذ ہے اور قرآن مجید نے وحدت وحی کا اثبات کیا ہے۔ دونوں بیانیوں میں ایک حد تک جزوی اور سطحی مماثلت ہے مثلاً کرداروں کے نام، ان کا جائے وقوع، بعض واقعات کا پس منظر وغیرہ۔ البتہ روحانی، اخلاقی، فنی اور منطقی لحاظ سے دونوں میں بُعد زمین اور آسمان کا ہے۔ اس کی وجہ بائبل کا محرّف اور غیر محفوظ ہونا اور قرآن مجید کی حفاظت، حقانیت اور صداقت ہے۔ بائبل میں کثرت سے الحاقی مواد شامل ہیں اور ان میں سرشت انسانی کی کار فرمائی جابجا ملتی ہے اور خدا، فرشتوں اور حوادث اور واقعات کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے جس سے عقل سلیم اِبا اور اخلاق اور ضمیر نفور کرتے ہیں۔ بائبل کے مؤلفین کو خدا، پیغمبروں، حوّا، اور اخلاق فاضلہ کو داغدار کرنے میں کوئی باک نہیں محسوس ہوتا۔ بائبل کا بیانیہ ایسا قبیح، مخرب اخلاق اور غیر منطقی ہے کہ اسے کلام الٰہی سے منسوب کرنا ہی شرمناک ہے بہر کیف بائبل کا یہ گویا ناگفتہ بہ بیانیہ یہودی / عیسائی عقیدے کی اساس ہے:

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

آدمؑ، حوّا اور شیطان سے متعلق اسی مصرعے کا مصداق بائبل کا متن [۳] بغرض مطالعہ اور عبرت پیش ہے:

تخلیق آدمؑ و حوّا:

”خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوش نما اور کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے......اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا کہ تو باغ کے ہر پھل کو بلا روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کے پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔ اور خداوند خدا نے کہا کہ آدم کا اکیلا رہنا

---

[۳] یہاں بائبل کا یہ مستند اردو ترجمہ استعمال کیا گیا ہے: مقدس کتاب، بائبل سوسائٹی آف انڈیا، بنگلور، ۲۰۱۵ء

اچھا نہیں۔ میں اس کے لئے ایک مدد گار اس کی مانند بناؤں گا۔ اور خداوند خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی سے بنائے اور آدم کے پاس لایا کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے اور آدم نے کل چوپایوں اور ہوا کے پرندوں اور کل دشتی جانوروں کے نام رکھے...اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا......اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا"(Book of Genesis/ پیدائش ۲:۸- ۱۰، ۱۵ - ۲۱ اور ۲۲ اور ۲۴)۔

بائبل کے اس بیانیے میں تحریفات، غیر الہامی، غیر اخلاقی اور غیر منطقی اضافے: یہاں سپاٹ، بے معنی انداز میں انسان کی تخلیق مذکور ہے، وہ بھی کسی مجہول راوی کی زبانی ہے۔ یہ خلاق العلیم خدا کا بیان نہیں ہے۔ روحانی اور اخلاقی لحاظ سے یہ امر حیرت انگیز بھی ہے اور مغالطہ کن بھی کہ تخلیق کا مقصد ہی سرے سے مفقود ہے۔ انسان سے ایمان اور اطاعت کا کوئی مطالبہ ہی نہیں، اس کے وجود کا کوئی مقصد نہیں، خلیفہ فی الارض یا اشرف المخلوقات ہونے کا شرف غائب۔ تخلیق کائنات میں جہاں چرند پرند اور دیگر مظاہر فطرت وجود میں آئے، اسی ذیل میں انسان نامی مخلوق بھی وجود میں آگئی۔ رب العالمین اور بندے کے مابین کوئی تعلق ہی نہیں، اطاعت الٰہی، تقرب خصوصی، آخرت کی ابدی زندگی میں فوز و فلاح، ہدایت الٰہی پر تابع ہونے کی تاکید جو کہ دینی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کے لئے لازم ہیں ان پر مطلق سکوت۔ یہاں قدرۃً سوال ایسے خالق کے علم اور حکمت، تدبر اور منصوبہ بندی پر اٹھتا ہے۔

- شجر ممنوعہ سے باز رہنے کے لئے دھمکی موت کی دی گئی ہے، گویا موت اصلاً انسان کی تخلیق کے منصوبے میں شامل ہی نہ تھی اور موت زندگی کے ایک مرحلے اور دار الجزاء میں داخلے کا نام نہیں بلکہ ایک دہشت ناک واقعہ ہے جس سے آدم کی زندگی مطلق ختم ہو جائے گی۔ حیات بعد الموت، جزا و سزا، جنت اور دوزخ کے تصورات مفقود۔ قرآن مجید میں اس کے برعکس شجر ممنوعہ کے مرتکب مجرم کو ظالم قرار دیا گیا ہے جس کے منطقی مرحلے سزا اور توبہ ہیں۔ بائبل میں عبد اور معبود کے درمیان کوئی رشتہ، تعلق ہی نظر نہیں آتا۔
- علام الغیوب خدا نے آدم کو اشیاء کے نام نہیں سکھائے بلکہ آدم نے اسماء خود ہی مقرر کئے۔

علم وہبی کے بجائے یہ علم کسبی کیسا غیر منطقی ہے!

- اس پورے بیانیے سے فرشتے غائب ہیں۔ وہ آدم کو سجدۂ تعظیمی بھی بجا نہیں لاتے، شرف انسانیت کا کوئی اثبات نہیں۔

- آدم کی جنس بلکہ وجود سے حوّا کی تخلیق بلا غبار ہے البتہ یہ صراحت بلکہ عمومی اعلان عام کہ اپنی بیوی کی خاطر انسان اپنے والدین سے مطلق قطع تعلق کرے گا اور اس کی توجہ کا مرکز صرف اس کی بیوی رہے گی، اخلاق اور انسانیت کے خون کے مرادف ہے۔ قرآن مجید میں جابجا والدین کی تکریم کی تاکید ہے، بائبل میں "ماں باپ کو چھوڑنے" کا کلیہ آب و تاب کے ساتھ درج ہے۔ عائلی نظام، والدین پر مشتمل خاندان جیسے بنیادی اور مقدس ادارے کی ایسی پائمالی کیا کسی مذہبی صحیفے کی زینت ہو سکتی ہے؟

- باغ عدن میں آدمؑ کا مقصد حیات اس باغ کی باغبانی اور نگہبانی قرار دیا گیا۔ اپنے رب کی تحمید، تمجید، تقدیس اور تعظیم مطلق مذکور نہیں۔ تخلیق آدمؑ کا مقصد باغ عدن کی باغبانی؟ ایں چہ بو العجبی! روحانیات اور ایمانیات کے سبق بائبل میں ندارد ہیں۔

شجر ممنوعہ، شیطان، باغ عدن سے جلاوطنی اور خدا کا آدمؑ، حوّا اور شیطان پر قہر اور لعنت سے متعلق بائبل کا بیانیہ:

"اور سانپ کل دشتی جانوروں میں سے جن کو خدا نے بنایا تھا چالاک تھا، اس نے عورت سے کہا کہ کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا۔ عورت نے سانپ سے کہا کہ جو درخت باغ کے بیچ میں ہے، اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مروگے۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ عورت نے جو یہ دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوش نما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں ... اور انھوں نے خداوند خدا کی آواز سنی جو ٹھنڈے وقت میں باغ میں پھرتا تھا اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور

سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟... کیا تونے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا- آدم نے کہا جس عورت کو تونے میرے ساتھ کیا ہے، اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا: یہ تونے کیا کیا۔ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھے بہکا دیا تو میں نے کھایا۔ اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا کہ اس لئے کہ تونے یہ کیا تو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا۔ اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈال دوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا۔ پھر خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ میں تیرے درد حمل کو بہت بڑھا دوں گا تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی جانب ہو گی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ اور آدم سے اس نے کہا کہ چونکہ تونے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا اس لئے زمین تیرے سبب لعنتی ہوئی۔ مشقت سے تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا... تو اپنے منھ کے پسینے کی روٹی کھائے گا" (پیدائش ۱۹-۱:۳)۔

بائبل کے اس بیانیے کا محاکمہ:

- یہاں گناہ کے صدور میں سانپ کے بھیس میں شیطان کا مرکزی کردار ہے۔ شیطان/سانپ کی آدم اور حوّا سے عداوت کی وجہ کیا تھی، اس کا بیان دوسرے اقتباس میں ہے۔ بہر کیف یہ حقیقت ہے کہ ایک مبینہ کتاب الٰہی میں بنی نوع انسان اور ایک رینگنے والے جاندار کے درمیان ازلی عداوت کا حکم شامل ہے، اس پر ازلی لعنت مستزاد- قرآن مجید میں کسی ذی روح سے ایسی شقاوت کا کوئی گزر نہیں۔ اہل ایمان کی آزمائش کے لئے اور ان کی اطاعت الٰہی کو پرکھنے کے لئے ماکولات میں سے صرف خنزیر کے گوشت کو نہ کھانے کا حکم ہے، اس جانور کو نیست و نابود کرنا جزو ایمان قطعاً نہیں۔

- قرآن مجید میں یہ صراحت ہے کہ آدم اور حوا دونوں سے شیطان کی ترغیب کی بناء پر لغزش ہوئی، دونوں نے اظہار ندامت کیا، اللہ تعالی نے ان کی توبہ قبول کرلی اور انھیں زمین پر بھیج دیا تا کہ ایک معین مدت تک وہ وہاں نفع حاصل کریں، ہدایت الٰہی کا اتباع کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر

کریں، زمین پر ان کے لئے موت اور پھر نشور ہے اور آخرت کی ابدی زندگی میں وہ اپنے عقیدے اور عمل کے مطابق جزا اور سزا کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔ احکم الحاکمین اللہ تعالی ان کی موت اور پھر ان کے ثواب اور عذاب کا فیصلہ بلا شرکت غیرے کرے گا۔ قرآنی بیانیے میں کوئی صنفی جانبداری نہیں ہے (سورہ البقرہ ۳۹-۲:۳۰ اور الاعراف ۲۷-۷:۱۱)۔

بعض مغربی فضلاء نے اس مقام پر یہ اعتراض کر کے اپنی دانست میں بڑا تیر مارا ہے کہ قرآن مجید میں حوّا کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ اولاً قرآن مجید بائبل کی مانند کوئی تذکرہ نہیں جو صرف انبیائے کرام کے نام ہی نہیں بلکہ ان کے مکمل شجرۂ نسب سے متعلق نام بہ نام تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ ہجرت مدینہ کے دوران غار میں رسول اکرمؐ کے رفیق (سورہ التوبہ ۹:۴۰)، سورہ الکھف میں موسیٰؑ کے ہم سفر جن کو اللہ نے خصوصی علم عطا کیا تھا اور خود رسولؐ اللہ کا اسم گرامی معدودے چند مقامات ہی پر مذکور ہے گو قرآن مجید کے براہ راست مخاطب آپؐ ہی تھے۔ قرآنی واقعات کے پس پشت شامل اہل مکہ اور صحابہ کرام کی فہرست انتہائی طول طویل ہے لیکن قرآن مجید میں نام صرف دو (۲) ابولہب اور زیدؓ کے آئے ہیں۔ ناموں کا تذکرہ قرآن مجید کا مطلوب نہیں، اصل مقصود شخصیات اور واقعات سے بر آمد روحانی اور اخلاقی سبق اور راہ بینی ہے۔

مزید بر آں، بائبل میں حوّا کی جو ذلت آمیز تصویر کشی کی گئی ہے (شیطان کی ترغیب کا شکار ہونا، قہر الٰہی کا مورد ہونا اور اپنے شوہر کا ہمیشہ محکوم رہنا) اس پر ان مغربی فضلاء کا سکوت دوسرے کی آنکھ میں تنکے کو نمایاں کرنا اور اپنی آنکھ میں شہتیر سے اغماض برتنے کے مرادف ہے۔ بائبل میں اصل مجرم حوّا ہیں۔ اسی مناسبت سے خدا نے ان کو سزا بھی شدید تر دی یعنی دردزہ میں اضافہ جو کہ ہر عورت کا مقدر ہے اور اسے زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ بائبل کے اس کھلے ہوئے صنفی امتیاز سے ارباب کلیسا اور عام عیسائی ایسا متاثر ہوئے کہ انھوں نے عورت کو صدیوں تک شر مجسم گردانا۔ اسی باعث ارباب کلیسا شادی سے محترز رہے کہ عورت کے فتنے سے محفوظ رہیں۔ اسی ذہنیت کے زیر اثر اوائل بیسویں صدی تک مغرب میں عورت کو معاشی حقوق مطلق حاصل نہیں تھے بلکہ وہ اپنی ساری زندگی کسی مرد (اپنے والد، شوہر یا بیٹے) کی دست نگر رہتی تھی۔ یہ طعنہ کلیسار مغرب میں عام تھا کہ چونکہ عورت ذات نے آدم اور بنی آدم کے باغ عدن سے اخراج میں کلیدی کردار ادا کیا، اس لئے اسے کبھی اپنا گھر نصیب نہیں ہوگا، وہ اپنے والد / شوہر / بیٹے کی چھت

تلے اپنی زندگی بسر کرے گی۔

اس سے بھی زیادہ سنگین بائبل کی یہ عبارت ہے: "تیرا شوہر تجھ پر حکومت کرے گا"۔ صنفی امتیاز اور عورت کی محکومیت کا کیسا فاش اعلان۔ اس کے باوصف مغربی فضلاء روز اول سے اس گمراہ کن خیال کی اشاعت کے درپے رہے ہیں کہ اسلام میں عورت کی حیثیت کمتر ہے اور انھیں سخت اعتراض سورہ النساء کی آیت: ۳۴ پر رہتا ہے جس میں مرد کی قوامیت (نگہ بانی، خبر گیری) اور نشوز کی مرتکب بیوی کے خلاف مرحلے وار کارروائی مذکور ہے۔ انصاف کا یہ دہرا معیار کیسی ستم ظریفی ہے۔ بائبل کے اس عورت مخالف موقف کے پس منظر میں عیسائی مغرب میں صنفی ناانصافی کے خلاف تحریک حقوق نسواں (Feminism) کا برپا ہونا کچھ ایسا عجب نہیں۔ اسلام نے شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کا لباس یا تکملہ قرار دیا ہے اور دونوں کے حقوق اور فرائض کو ملحوظ رکھا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں ماں کی فضیلت، عورت کے اعلی اور ارفع مقام پر دال ہے۔

- آدمؑ بھی عتاب خداوندی کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ اور تا قیامت ان کی ذریت انتہائی مشقت کے ساتھ اپنی روزی کمائے گی۔ یہاں روزی روٹی کو صرف "لعنتی" زمین کی پیداوار تک محدود کرنا عالم الغیب اور رزاق خداوند کے شایان شان نہیں کہ آمدنی کے ذرائع روز اول سے متنوع اور متعدد رہے ہیں۔ ابتداء تہذیب میں زراعت ذریعۂ معاش تھی بھی نہیں۔

بائبل کے "آدمؑ" میں خلیفۃ اللہ کی کوئی رمق نہیں، نہ اپنی لغزش پر ندامت کا اظہار، نہ توبہ و استغفار کا اہتمام، تعلق باللہ بالکل مفقود۔ اپنے رب سے آئندہ کے لئے نصیحت اور ہدایت سے محروم۔ انتہائی بے توقیری کے ساتھ خدا کا ان کے ساتھ سلوک یہ ہے: "خداوند خدا نے آدم کو باغ عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ اس زمین کی جس میں سے وہ لیا گیا تھا، کھیتی کرے۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا" (پیدائش ۳:۲۲)۔

پیغمبر اول ابوالبشر آدمؑ کا مقدر صرف کھیتی کرنا! تخلیق آدم کا کیسا پست اور سطحی تصور۔ اس میں خدائی منصوبے کی کوئی شان نظر نہیں آتی۔ صرف آدم ہی نہیں خدا کی بھی کیسی معمولی تصویر کشی ہے۔

خدا کا تصور: آدم کو خدا نے صرف ذلیل اور بے عزت ہی نہیں کیا بلکہ اسے اپنا حریف اور رقیب گردانا۔ خوف، حسد اور رقابت کے اس پیکر کو مالک الملک، رب العالمین اور احکم الحاکمین خدا کیسے

تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ ایسی بے بس، غیر محفوظ ہستی کو معبود کیسے قرار دیا جاسکتا ہے: "اور خداوند خدا نے کہا: دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے... چنانچہ اس نے آدم کو باہر نکال دیا اور باغ عدن کے مشرق کی طرف کروبیوں (فرشتوں) اور چو گرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی کے درخت کی حفاظت کریں" (پیدائش ۲۲:۳اور ۲۴)۔

خدا کو اپنی ہی مخلوق انسان سے خطرہ اور اپنی حفاظت کے لئے فرشتوں اور تلوار پر انحصار۔ جبار اور قہار خدا کا کیسا مضحکہ خیز اور عبرت انگیز تصور ہے!

بائبل کے تصور خدا میں تجسیم شرمناک حد تک رچی بسی ہوئی ہے۔ عام انسان کے اعمال، اقوال، جذبات اور ردعمل اور حرکات وسکنات خدا سے بلا تکلف منسوب ہیں۔ ایسی شخصیت کو رب العالمین یا قادر مطلق خدا تسلیم کرنا نا قابل تصور ہے۔ خدا کی گستاخانہ تجسیم کی چند مثالیں بائبل کے متن سے استغفار طلب کرتے ہوئے پیش ہیں:

(۱) سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا، خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن فارغ ہوا اور آرام کیا۔ خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا (پیدائش ۳:۲)۔

(۲) یعقوب اکیلا رہ گیا اور پو پھٹنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اس سے کشتی لڑتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ یعقوب پر غالب نہیں ہوتا تو اس کی ران کو اندر کی طرف سے چھوا اور یعقوب کی ران کی نس اس کے ساتھ کشتی کرنے میں چڑھ گئی اور اس نے کہا کہ مجھے جانے دے کیونکہ پو پھٹ چلی۔ یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ تب اس نے یعقوب سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے۔ اس نے جواب دیا: "یعقوب"۔ اس نے کہا کہ تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہو گا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔ تب یعقوب نے اس سے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو مجھے اپنا نام بتادے۔ اس نے کہا کہ تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے اور اس نے اسے وہاں برکت دی۔ اور یعقوب نے اس جگہ کا نام فنی ایل رکھا اور کہا کہ میں نے خدا کو روبرو دیکھا تو بھی میری جان بچی رہی اور جب وہ فنی ایل سے گزر رہا تھا تو آفتاب طلوع ہوا اور وہ اپنی ران سے لنگڑاتا تھا۔ اسی سبب سے بنی اسرائیل اس نس کو جو ران میں

اندر کی طرف ہے، آج تک نہیں کھاتے کیونکہ اس شخص نے یعقوب کی ران کی نس کو جو اندر کی طرف سے چڑھ گئی تھی چھو دیا تھا(پیدائش ۲۴: ۳۰۔۳۲)۔

(۳) جب روئے زمین پر آدمی بہت بڑھنے لگے اور ان کی بیٹیاں پیدا ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوب صورت ہیں اور جن کو انھوں نے چنا ان سے بیاہ کر لیا تب خداوند نے کہا کہ میری روح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرتے رہے گی کیونکہ وہ بھی تو بشر ہے اور اس کی عمر ایک سو بیس برس کی ہوگی۔ ان دنوں زمین پر جبار تھے اور بعد میں جب خدا کے بیٹے انسان کی بیٹیوں کے پاس گئے تو ان کے لئے ان سے اولاد ہوئی۔ یہی قدیم زمانے کے سورما ہیں جو بڑے نامور ہوئے ہیں۔ اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دل کے تصور اور خیالات سدا برے ہی ہوتے ہیں تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین سے مٹا ڈالوں گا انسان سے لے کر حیوان اور رینگنے والے جاندار اور ہوا کے پرندوں تک کیونکہ میں ان کے بنانے سے ملول ہوں (پیدائش ۸-۶:۱)۔

(۴) کتنی بار بنی اسرائیل نے بیاباں میں خدا سے سرکشی اور صحرا میں اسے آزردہ کیا اور پھر وہ خدا کو آزمانے لگے اور انھوں نے اسرائیل کے قدوس کو ناراض کیا (زبور ۴۰۔۷۸:۴۰)۔

(۵) موسیٰ، ہارون، ندب اور ابیہو اور بنی اسرائیل کے ستّر بزرگ اوپر گئے اور انھوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترا سا تھا۔ سو انھوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا پیا (خروج ۱۱-۹:۲۴)۔

(۶) شریعت تو موسیٰ کو دی گئی مگر فضل اور سچائی یسوع مسیح کی معرفت پہنچی۔ خدا کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا (یوحنا کی انجیل ۱:۱۸)۔

(۷) موسیٰ نے خداوند سے کہا اے خداوند! میں فصیح نہیں، نہ تو پہلے تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا بلکہ رک رک کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے...... اے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں کہ کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے یہ پیغام بھیج۔ تب خداوند کا قہر موسیٰ پر بھڑکا (خروج ۱۰:۴ اور ۱۴-۱۳)۔

(۸) میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں ان کی اولاد کو تیسری

چوتھی پشت تک باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں۔ (خروج ٦-۵:۲۰)۔

شیطان خدا کا حریف اور خدا کے خلاف باغی فرشتوں کے ساتھ اس کی جنگ: تصور خدا کو داغدار کرنے کی رہی سہی کسر بائبل کے اس بیانیے سے پوری ہو جاتی ہے جو شیطان سے متعلق ہے اور جس کا براہ راست گہرا تعلق واقعۂ آدمؑ اور حوا سے ہے۔ بائبل کی رو سے شیطان جن نہیں بلکہ فرشتہ ہے بلکہ فرشتہ بھی ایسا جس کو خدا سے ہم سری کا دعوی تھا۔ جب اسے علم ہوا کہ عرش الٰہی کے دائیں جانب عیسیٰؑ بطور ابن اللہ فروکش ہوں گے، تثلیث کے لازمی جزو کے طور پر خدا ہوں گے، شافع محشر ہوں گے، اس کی آتش حسد بھڑکی اور اس نے خدا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یک نہ شد دو شد اس جنگ میں خدا سے باغی فرشتے بھی شیطان کی قیادت اور سیادت میں صف آراء ہو گئے اور گھمسان کا رن پڑا۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ کل فرشتوں کی ایک تہائی تعداد نے خروج کیا:

> پھر آسمان پر لڑائی ہوئی۔ میکائل اور اس کے فرشتے اژدہا سے لڑنے کو نکلے اور اژدہا اور اس کے فرشتے ان سے لڑے لیکن غالب نہ آئے اور اس کے بعد آسمان پر ان کے لئے جگہ نہیں رہی۔ وہ بڑا اژدہا یعنی وہی پرانا سانپ جو ابلیس اور شیطان کہلاتا ہے اور سارے جہان کو گمراہ کر دیتا ہے زمین پر گرا دیا گیا اور اس کے فرشتے بھی اس کے ساتھ گرا دیے گئے (یوحنا عارف کا مکاشفہ ۱۲: ۷-۱۱)۔

یہ "جنگ" آدم کی تخلیق سے قبل ہوئی۔ جنگ کے انجام سے شیطان پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ براہ راست جنگ میں خدا کو زیر نہیں کر سکتا، اس لئے اس نے یہ حکمت عملی تیار کی کہ سانپ کے بھیس میں وہ باغ عدن میں داخل ہو کر خدا کی نئی مخلوق آدمؑ اور حوّا کو خدا کا نافرمان بنائے اور اس طرح اپنی آتش انتقام کو سرد کرے۔ آدم اور حوّا اس کے اِغواء (بہکانے) کا شکار ہوئے۔ اس کی تفصیل مقالے کے آغاز میں درج ہے۔

قرآنی بیانیے کے امتیازات اور بائبل کے بیانیے سے اس کی جداگانہ حیثیت: قرآن مجید میں آدمؑ، حوّا اور شیطان سے متعلق بیانیہ جابجا آیا ہے جو کہ مسلمانوں کے لئے جزو ایمان اور معروف امر ہے لہذا محض چند منتخب آیات قرآنی پیش ہیں:

۱- (وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ{۳۰} وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاء كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَؤُلاء إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ{۳۱} قَالُواْ

سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ{۳۲} قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ{۳۳} وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلاَئِكَةِ اسْجُدُواْ لآدَمَ فَسَجَدُواْ إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ{۳٤} وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ{۳٥} فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُواْ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ{۳٦} فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ{۳۷} قُلْنَا اهْبِطُواْ مِنْهَا جَمِيعاً فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ{۳۸} وَالَّذِينَ كَفَرواْ وَكَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا أُولَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ{۳۹})

ترجمہ: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، تو انہوں نے کہا ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے؟ اور ہم تیری تسبیح، حمد اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے{۳۰} اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا، اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ{۳۱} ان سب نے کہا اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے، پورے علم و حکمت والا تو تو ہی ہے{۳۲} اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) سے فرمایا تم ان کے نام بتا دو۔ جب انہوں نے بتا دیئے تو فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں (پہلے ہی) نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمانوں کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپاتے تھے{۳۳} اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں ہو گیا{۳۴} اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو، لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے{۳۵} لیکن شیطان نے ان کو بہکا کر وہاں سے نکلوا ہی دیا اور ہم نے کہہ دیا کہ اتر جاؤ! تم [انسان اور شیطان] ایک دوسرے کے دشمن ہو اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے{۳۶} (حضرت) آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بیشک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے{۳۷} ہم نے کہا تم سب یہاں سے چلے جاؤ، جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت پہنچے تو اس

کی تابعداری کرنے والوں پر کوئی خوف و غم نہیں {۳۸} اور جو انکار کر کے ہماری آیتوں کو جھٹلائیں، وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے {۳۹}) (البقرۃ ۲: ۳۹-۳۰)[۴]

۲- (وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلآئِكَةِ اسْجُدُواْ لآدَمَ فَسَجَدُواْ إِلاَّ إِبْلِيسَ لَمْ يَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ {١١} قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلاَّ تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَاْ خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ {١٢} قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ {١٣} قَالَ أَنظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ {١٤} قَالَ إِنَّكَ مِنَ المُنظَرِينَ {١٥} قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ {١٦} ثُمَّ لآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ وَلاَ تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ {١٧} قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْؤُومًا مَّدْحُورًا لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لأَمْلأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ {١٨} وَيَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلاَ مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَـذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ {١٩} فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَـذِهِ الشَّجَرَةِ إِلاَّ أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ {٢٠} وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ {٢١} فَدَلاَّهُمَا بِغُرُورٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَآنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ {٢٢} قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ {٢٣} قَالَ اهْبِطُواْ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ {٢٤} قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ {٢٥} يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَىَ ذَلِكَ خَيْرٌ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ {٢٦} يَا بَنِي آدَمَ لاَ يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لاَ تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاء لِلَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ {٢٧})

ترجمہ: (اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم ہی نے تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا {۱۱} حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تو تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے، جبکہ میں تجھ کو حکم دے چکا، کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے {۱۲} حق تعالیٰ نے فرمایا آسمان سے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو آسمان میں رہ کر تکبر کرے سو نکل بے

[۴] یہاں قرآن مجید کا یہ اردو ترجمہ پیش نظر رہا ہے: قرآن کریم مع اردو ترجمہ و تفسیر از مولانا محمد جوناگڑھی، مجمع الملک شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ، سعودی عرب۔

شک تو ذلیلوں میں سے ہے {۱۳} اس نے کہا کہ مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک {۱۴} اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی {۱۵} اس نے کہا بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا {۱۶} پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی اور آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پایئے گا {۱۷} اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں سے ذلیل وخوار ہو کر نکل جا جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا {۱۸} اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ پھر جس جگہ سے چاہو دونوں کھاؤ، اور اس درخت کے پاس مت جاؤ ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے {۱۹} پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں دونوں کے روبرو بے پردہ کر دے اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا، مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے ہو جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ {۲۰} اور ان دونوں کے روبرو قسم کھالی کہ یقین جانیئے میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں {۲۱} سو ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا پس ان دونوں نے جب درخت کو چکھا دونوں کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے روبرو بے پردہ ہو گئیں اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے منع نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے؟ {۲۲} دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے {۲۳} حق تعالیٰ نے فرمایا کہ نیچے ایسی حالت میں جاؤ کہ تم [انسان اور شیطان] باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور نفع حاصل کرنا ہے ایک وقت تک {۲۴} فرمایا تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے پھر نکالے جاؤ گے {۲۵} اے آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہاری شرم گاہوں کو بھی چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے اور تقوے کا لباس، یہ اس سے بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ یہ لوگ یاد رکھیں {۲۶} اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جیسا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے باہر کرا دیا ایسی حالت میں ان کا لباس بھی اتروا دیا تاکہ

وہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھائے۔ وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو۔ ہم نے شیطانوں کو ان ہی لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے{۲۷}) (الأعراف۷: ۱۱-۲۷)

قرآنی بیانیہ اعتقادی، روحانی، اخلاقی اور منطقی لحاظ سے بائبل کے بیانیے سے ناقابل تردید طور پر برتر اور ایمان افروز ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل امتیازات مغربی فضلاء کی اس صریح کذب بیانی کی نفی کرتے ہیں کہ قرآن مجید کسی بھی اعتبار سے بائبل کا چربہ یا سرقہ ہے۔ سطحی مماثلتیں یقیناً ہیں کہ ان دونوں کا ماخذ واحد اور یکساں وحی الٰہی ہے البتہ بائبل کے بیانیے میں تحریفات در آئی ہیں جن سے عقائد اور اخلاق مجروح ہوتے ہیں اور اس کے قارئین ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہیں اور ہدایت الٰہی سے محروم گمراہی میں پڑے رہتے ہیں۔ بائبل کا بیانیہ عقلی اور منطقی لحاظ سے بھی ایسا مضحکہ خیز ہے کہ وہ قارئین کو متاثر نہیں کرتا۔ بائبل / عیسائیت / کلیسا سے عام عیسائیوں کو رغبت صدیوں سے نہیں ہے اور اس زوال کا باعث بڑی حد تک بائبل کا تحریف شدہ متن ہے۔ خدا، مقصد تخلیق، خلافت ارضی، فرشتوں اور جنوں، صنفی عقائد اور آخرت جیسے کلیدی عقائد میں دست برد کے پیش نظر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ساتویں صدی عیسوی میں محمد رسول اللہ ﷺ کو آخری وحی سے سرفراز کیا اور قرآن مجید کی تا قیامت حفاظت کا غیر معمولی نظم فرمایا تاکہ بنی نوع انسان کو ہدایت الٰہی ہر مقام و زمان میں میسر رہے اور آخرت میں اسے خسارہ نہ ہو۔

اصل مقصود بطور خاتمہ کلام قرآنی بیانیے کے وہ حیات بخش اور ایمان افروز پہلو ہیں جو بائبل میں مفقود ہیں اور جو قرآن مجید کے طبع زاد اور حقانیت اور صداقت سے مملو ہونے کے شاہد ہیں:

* قرآن مجید میں بیانیہ تمام تر قادر مطلق اللہ کی زبانی ادا ہوا ہے۔ بائبل میں ایک مجہول نامعلوم راوی ہے، اسے خدائی منصوبے کا کیسے علم ہوا؟ یہ عقدہ سربستہ راز ہی رہتا ہے۔
* قرآن مجید میں باغی فرشتوں کا کوئی تصور نہیں۔ جنگ اور مزاحمت در کنار، وہ اللہ کی مطیع مخلوق ہیں اور اس کے فرمان کے مطابق آدم کو سجدہ تعظیمی بجالاتے ہیں جو آدمؑ کی عظمت پر دال ہے۔ بائبل میں فرشتوں کے سجدے کا ذکر نہیں۔
* قرآن مجید کے مطابق آدمؑ اور حوا دونوں سے لغزش ہوئی اور پشیمان ہوئے، اللہ نے ان کو توبہ کے کلمات سکھائے اور اپنے وسیع تر منصوبے کے تحت آزمائش کے لئے انھیں زمین پر بھیج دیا اور ان کی ذریت کے لئے مستقل ہدایت الٰہی یعنی رسالت / صحف سماوی / شریعت کا نظم فرمایا۔ بائبل ان

عقائد اور روحانی اور اخلاقی تعلیمات سے عاری ہے۔

* قرآن مجید نے بائبل کے برعکس صرف حوّا کو مورد الزام نہیں قرار دیا ہے، خاطی دونوں ہیں۔ بائبل کے اس بیانیے کے زیر اثر کلیسا/عیسائیت میں عورت کو شر مجسم تصور کیا گیا اور اس سے نفور کی تعلیم عام رہی حتی کہ شادی کی روایت مجروح ہوئی۔

* قرآنی بیانیے میں حکم عدولی کی بناء پر آدمؑ، حوّا اور شیطان/سانپ پر غیظ و غضب کا مظاہرہ اور ذلت آمیز سزاؤں کا صدور مذکور نہیں ہے۔ بائبل کے بیانیے کے باعث عیسائیت میں ''ازلی گناہ'' کا عقیدہ پروان چڑھا کہ شجر ممنوعہ کھانے کی پاداش میں بنی نوع انسان خدا کی مجرم ہے اور کفارے/توبہ کی واحد صورت یہ ہے کہ عیسیٰؑ پر بطور ابن اللہ ایمان لایا جائے، صرف وہی بنی نوع انسان کے شافع اور نجات دہندہ ہیں۔ یہ فتنہ در فتنہ ہے جو شرک پر منتج ہوتا ہے۔

* قرآن مجید کی رو سے اللہ علام الغیوب اور حاضر و ناظر مطلق ہے۔ بائبل کا عبرت ناک بیان ہے کہ ''خدا ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا تب خدا نے آدم کو پکارا تو کہاں ہے ؟ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا؟'' (پیدائش ۱۱-۹:۳)۔ حکم عدولی کے لئے آدم نے حوّا کو اور حوّا نے سانپ کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ ایسے محدود علم کی حامل ہستی کو خدا تسلیم کرنا بعید از عقل ہے۔

* قرآن مجید میں اللہ نے آدمؑ کا یہ شرف بیان کیا ہے کہ اللہ نے ان کو تمام نام سکھائے۔ ''کُلَّھَا'' مراد ہے کہ آدم/انسان کو تکوینی سلسلے میں تمام علوم پر دسترس حسب توفیق حاصل ہو گی۔ بائبل میں میں آدم کا دائرہ کار صرف جانوروں اور پرندوں کے نام مقرر کرنے تک محدود ہے (پیدائش ۲:۲۰)۔

* قرآن مجید میں اللہ نے آدمؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا مژدہ فرشتوں کی موجودگی میں سنایا اور ہبوط ارضی کے بعد آدمؑ کی یہ تکریم برقرار رہی کہ اس کی ذریت کو ہدایت الٰہی نصیب ہوتی رہے گی۔ اس کے بالمقابل بائبل کی رو سے آدم/انسان کا مقصد حیات زمین میں صرف ''کھیتی کرنا ہے'' (پیدائش ۳:۲۳)۔ دونوں بیانیوں میں ایمانی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ایسی بلندی اور ایسی پستی کا فرق!

* قرآنی بیانیہ آدمؑ کی عبودیت اور رجوع الی اللہ سے عبارت ہے۔ بائبل میں تعلق باللہ کا فقدان ہے۔ خدا کی نظر میں انسان کا مصرف صرف یہ ہے: ''خداوند خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا اور زمین پر اب تک کھیت کا کوئی پودا نہ تھا کیونکہ خداوند خدا نے زمین پر پانی نہیں برسایا تھا اور نہ زمین جوتنے

کے لئے کوئی انسان تھا" (پیدائش ۵:۲)۔بائبل کے بیانیے میں خلافت ارضی، تقرب الٰہی، عبادات، عمل صالح اور پیغام الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنا پیش نظر ہی نہیں ہیں۔ مغرب میں مادہ پرستی ایک حد تک اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔

* قرآن مجید میں تخلیق آدمؑ کے موقع پر فرشتے یہ عرض معروض کرتے ہیں:"ہم تیری حمد، تسبیح اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں... اے اللہ، تیری ذات پاک ہے۔ ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھارکھا ہے۔ پورے علم و حکمت والا تو تو ہی ہے" (البقرہ۲:۳۰ اور ۳۲)۔ بائبل میں فرشتوں سے متعلق مکمل سکوت ہے البتہ خدا سے میدان جنگ میں برسر پیکار غدار فرشتوں کی موجودگی کا بیان ہے۔ عقائد میں ایسے بنیادی اختلاف کے باوصف قرآن مجید کو بائبل سے مستعار قرار دینا مغربی فضلاء کی کور چشمی کی غماز ہے۔

اس موازنے سے یہ واضح ہے کہ قرآن مجید کا بیانیہ صریحاً منزل من اللہ ہے جو مربوط اور منطقی ہے۔ قرآن پاک حوّا اور سانپ کے خلاف شدید تعصّب سے پاک ہے اور عبد اور معبود کے مقدس رشتے کا اثبات کرتا ہے۔ اس کے برعکس بائبل کا بیانیہ تحریفات، خدا کی ترحم انگیز اور اسی کے پہلو بہ پہلو قاہرانہ اور حاسدانہ شبیہ اور اس کی تجسیم سے قابل نفرین حد تک مسخ ہے۔ دونوں بیانیوں میں فرق بنیادی نوعیت کا ہے اور قرآنی بیانیے کو بائبل کا سرقہ یا چربہ گرداننا اسلام/قرآن مجید کے خلاف محض بغض اور عناد کا آئینہ دار ہے[۴]۔

---

(۴) بائبل اور قرآن مجید میں قصص انبیاء میں بنیادی اختلافات اور قرآنی بیانیے کی اخلاقی رفعت اور منطقی پیش کش کے موضوع پر مزید مطالعے کے لئے دیکھئے:

- رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق کا اردو ترجمہ: بائبل سے قرآن تک، حافظی بک ڈپو، دیوبند، ۱۹۹۳ء
- عبد الماجد دریابادی، *Tafsir Al-Quran* (انگریزی) اور تفسیر ماجدی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ
- ظفر الاسلام خاں، *The Glorious Quran*، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز، نئی دہلی، ۲۰۲۳ء، ص: ۴۱-۳۳
- مہر علی، *The Quran and the Orientalists*، ص ۲۶-۸۸
- عبد الرحیم قدوائی، "قصہ یوسف توریت اور قرآن مجید میں: ایک موازنہ، مشمولہ جہات قرآنیات۔ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ، ۲۰۲۴ء، ص: ۴۷-۶۵
- عبد الرحیم قدوائی، حضرت اسماعیل کی شخصیت: بائبل اور قرآن میں، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل-جون ۲۰۲۵ء، ص: ۲۷-۴۶

حسرت موہانی کی ڈائری کے چند اوراق

پروفیسر فرانسِس رابنسن

ترجمہ وخلاصہ: محمد غزالی خان[۱]

بےلوث اور نڈر مجاہدِ آزادی، عظیم شاعر، اور بےباک صحافی مولانا حسرت موہانی کا انتقال ۱۳رمئی ۱۹۵۱ کو ہوا۔ اردو زبان میں اُن کی شاعری، بیباک صحافت اور پرجوش حب الوطنی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اب حسرت موہانی کی خدمات زیادہ تر نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ حسرت موہانی نے ۱۹۴۷ سے ۱۹۴۹ کے دوران پیش آنے والے دردناک مناظر کو اپنی ذاتی ڈائری میں قلم بند کیا تھا۔ ایک طویل عرصہ تک یہ ڈائری ایک نجی ذخیرے میں دفن رہی جو ایک تحقیقی کام کے دوران مشہور مورخ فرانسس رابنسن کے ہاتھ آ گئی۔ چند سال قبل، پروفیسر رابنسن نے اس غیر مطبوعہ ڈائری پر برٹش لائبریری میں ایک بصیرت افروز تبصرہ پیش کیا تھا۔ یہ تبصرہ پروفیسر رابنسن کی زبان میں پوڈکاسٹ کی صورت میں برٹش لائبریری کی ویب سائٹ پر موجود ہے[۲]۔ ذیل میں اُس گفتگو کے بیشتر حصے کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حسرت کی زندگی بزبانی پروفیسر فرانسس رابنسن

میں نے ابھی حال ہی میں مولانا جمال میاں فرنگی محلی کی سوانح حیات مکمل کی ہے، جو لکھنؤ کے فرنگی محل کی علمی روایات میں پروان چڑھنے والی آخری دو یا تین شخصیات میں سے ایک تھے۔ وہ ۱۹۴۰ کی دہائی میں مسلم لیگ کے اعلیٰ کمانڈ کے رکن بھی تھے، اور ۱۹۵۰ اور ۶۰ کی دہائیوں میں پاکستان کی سیاست میں ایک معمولی شخصیت تھے۔ ان کے کاغذات میں ان کی ڈائری بھی شامل

---

[۱] لندن میں مقیم صحافی محمد غزالی خان نے یہ تحریر اردو اور انگریزی میں اپنے بلاگ https://ghazalikhan.com/urdu/hasrats-diary/ پر شائع کی ہے۔ معارف کے لئے اس میں مزید تلخیص کر دی گئی ہے (ظ۔ا۔خ)۔

[۲] پروفیسر رابنسن کی انگریزی تقریر کا لنک یہ ہے: https://soundcloud.com/the-british-library/hasrat-mohani-diary

تھی، جو ۱۹۳۰ کی دہائی کے آخر سے شروع ہو کر اکیسویں صدی تک جاتی ہے، جو میری کتاب کا بنیادی ستون بنی۔ لیکن ان کے کاغذات میں حسرت موہانی کی ڈائریاں بھی تھیں، جو جنوری ۱۹۴۷ سے دسمبر ۱۹۴۹ تک کے عرصے کا احاطہ کرتی ہیں۔ آج میں انہی کے بارے میں بات کروں گا۔ اصل حالت میں یہ سب خط شکستہ میں ہیں، جو کہ اتنے چھوٹے حروف میں لکھی گئی ہے کہ اسے پڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ انہیں استعمال کرنے کے لئے مجھے انہیں خط نستعلیق میں لکھوانا پڑا۔

حسرت موہانی ہندوستان کے ممتاز مسلم ادیبوں میں شمار ہوتے تھے اور ایک اہم سیاستدان تھے۔ ان کا تعلق اناؤ کے قصبہ موہان کے ایک چھوٹے زمیندار خاندان سے تھا، جو لکھنؤ کے قریب واقع ہے۔ خاندانی روایت کے مطابق، تیرہویں صدی کے آغاز میں ان کے جد امجد سید محمود نے ایران کے شہر نیشاپور کے قریب موہان نامی مقام سے آکر اس قصبے موہان کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لحاظ سے، حسرت موہانی یقیناً اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایرانی نژاد، سادات خاندان کے وارث۔ ان کے آباو اجداد شاعر، حکیم، عالم اور صوفی تھے۔ ان کی والدہ کے والد، علی حسن موہانی، نے فرنگی محل سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں منصف مقرر ہوئے اور اُن لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے ۱۸۵۴ میں آگرہ میں لوتھرن مشنری ڈاکٹر فنڈر کے ساتھ مناظرہ کیا تھا۔ جن لوگوں نے اس مناظرے کی مختلف تفصیلات پڑھی ہیں، وہ غالباً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ مناظرہ مسلمانوں نے جیتا تھا۔

حسرت نے ابتدائی تعلیم خاندانی مکتب سے حاصل کی، اور بعد ازاں ایک سرکاری اسکول میں داخلہ لیا، جہاں ۱۸۹۹ میں انہوں نے صوبۂ متحدہ (یوپی) میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علمی لحاظ سے نہایت ذہین اور ہوشیار نوجوان تھے۔ اسی کارکردگی کی بنیاد پر انہیں علی گڑھ میں سرکاری وظیفہ ملا۔ علی گڑھ میں، ان کا میل جول اشرافیہ سے ہوا۔ یہاں وہ ایک ممتاز شاعر اور مقرر کے طور پر جانے گئے۔ ۱۹۰۳میں علی گڑھ سے اخراج کے بعد انہیں صرف امتحانات دینے کی اجازت دی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب حکام کے خلاف صف آرا ہونے کا ان کا رجحان سامنے آیا۔ ۱۹۰۳ میں ہی انہوں نے ادبی رسالہ 'اردوئے معلیٰ' شائع کرنا شروع کیا جسے وہ وقفے وقفے سے ۱۹۳۷ تک نکالتے رہے۔ ۱۹۰۷ میں انہیں اس بات پر قید کیا گیا کہ انہوں نے برطانوی حکام کو اُس مضمون نگار کا نام بتانے سے انکار کر دیا تھا جس نے 'اردوئے معلیٰ' میں

ایک مضمون شائع کروایا تھا۔ یہ مضمون نگار علی گڑھ کا کوئی طالب علم تھا جس نے مصر میں برطانوی تعلیمی پالیسی پر تنقید کی تھی۔ اس کا نام نہ بتانے پر حسرت موہانی کو دو سال قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۳ میں جب مسلمانوں کی جانب سے برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج میں زیادہ شدت آئی تو حسرت تحریک خلافت اور عالمی اسلامی مسائل سے اور زیادہ وابستہ ہو گئے۔ مثلاً ۱۹۱۳ میں وہ کانپور مسجد کے معاملے میں پیش پیش تھے، اور اسی دوران وہ اس مشہور سازش میں شامل ہو گئے جو "ریشمی رومال سازش" کے نام سے معروف ہے۔ اس میں عبید اللہ سندھی، محمود حسن، حسرت موہانی اور دیگر شامل تھے، جو افغان قبائل کو برطانیہ کے خلاف بغاوت پر اکسانا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۶ کے آغاز میں جب وہ سرحد کی طرف جا رہے تھے تو گرفتار کر لئے گئے اور باقی جنگ کے دوران قید میں رہے۔

سنہ ۱۹۲۰ کی دہائی میں، ان کے نظریاتی خیالات میں تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے اور وہ سوشلسٹ فکر میں گہری دلچسپی لینے لگے۔ وہ کانپور میں منعقد ہونے والی کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس کے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین بنے۔ وہ ۱۹۲۰ اور ۱۹۳۰ کی ابتدائی دہائی کے دوران عمومی طور پر کمیونزم میں دلچسپی لینے لگے۔ لیکن ۱۹۳۰ کی دہائی میں، ہندو احیاء پرستی کے اثر کے تحت، خصوصاً جب یہ اثر انڈین نیشنل کانگریس پر ظاہر ہوا، تو وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب مائل ہو گئے۔ ۱۹۳۷ میں لکھنؤ اجلاس میں، حسرت موہانی نے مکمل آزادی کو مسلم لیگ کی پالیسی بنانے کی قرارداد پیش کی۔

سنہ ۱۹۳۹ میں انھوں نے گیارہویں مرتبہ حج ادا کیا۔ وہاں سے وہ جمال میاں کے ساتھ بغداد گئے۔ جہاں انھوں نے عبد القادر جیلانی کے مزار پر حاضری دی۔ لیکن دراصل، ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ یورپ کے راستے برطانیہ جائیں اور ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ سے مل کر حالات کی وضاحت کریں۔ وہ بیروت اور اٹلی سے گزرے۔ ان کے پاس کوئی ویزا نہیں تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح وہ فرانس اور پھر لندن پہنچ ہی گئے۔

وہ ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ سے ملاقات کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے، اگرچہ اس ملاقات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، لیکن یہ سب کچھ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ رکاوٹوں سے قطعاً نہ گھبرانے والے انسان تھے۔ اگر انہیں لندن جانا تھا تو چاہے جنگ چھڑنے والی ہو، چاہے ان کے پاس ویزا نہ ہو، تب بھی وہ وہاں پہنچ گئے۔

اپنے آخری برسوں میں، یعنی ۱۹۴۶ سے، جو کہ اُن کی ڈائری کے مندرجات کا دورانیہ ہے، وہ یوپی قانون ساز اسمبلی، کانپور میونسپل بورڈ اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے رکن بھی بنے۔ لہٰذا وہ نمائندہ حیثیتوں کے ایک اچھے خاصے مجموعے کے حامل تھے۔

انھوں نے ۱۹۵۱ میں فرنگی محل میں وفات پائی اور وہیں فرنگی محل باغ میں دفن کیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وفات کے وقت انہوں نے کہا: "یہ سب لوگ میرے گرد کیوں رو رہے ہیں؟ یہاں کوئی انوکھا واقعہ تو نہیں ہو رہا"۔ لیکن یہ سب ان کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ حسرت واقعی اپنی ذات میں ایک مکمل شخصیت تھے۔ وہ نڈر تھے، اصولوں کے پابند تھے اور یہ وصف ان کی ڈائری سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

میں نے ان ڈائریوں (۱۹۴۹-۱۹۴۷ء) کو درج ذیل عمومی حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کا مقامی سے قومی سطح تک جائزہ: ڈائری ہمیں بتاتی ہے کہ اس وقت مسلمان کن حالات سے گزر رہے تھے۔

(۲) حسرت بحیثیت ادیب، اخبار نویس، موثر پیامبر، اور شاعر: اس سے ایک ادبی شخصیت کی روز مرہ زندگی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

(۳) حسرت کی روحانی اور خوابوں کی دنیا: میں ان خوابوں میں خاص دلچسپی رکھتا ہوں جو یہ لوگ دیکھا کرتے تھے۔

(۴) کچھ منتشر لیکن بصیرت افروز نکات۔

ہندوستانی مسلمانوں کی حالت

ہندوستانی مسلمان اُس وقت خاص طور پر شمالی ہندوستان میں نہایت مشکل دور سے گزر رہے تھے۔ یہ ڈائری حسرت کی سرگرمیوں کو بے حد خوبی سے ظاہر کرتی ہے، خاص طور پر جب وہ کانپور میونسپل بورڈ کے رکن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وہ اسکولوں کا دورہ کرتے ہیں۔ ایک اسکول جس کا وہ دورہ کرتے ہیں، وہ محمد علی جوہر جونیئر اسکول فار گرلز ہے۔ وہ راشننگ جیسے بڑے مسئلے سے نمٹ رہے ہیں، جو جنگ کے بعد کا ایک بڑا چیلنج تھا۔

وہ مزدور یونینوں سے بھی معاملہ کر رہے ہیں۔ وہ ایک با اصول شخص تھے لیکن اس کے باوجود وہ انتخابات میں گڑبڑ کرتے ہیں اور "سفارش" سے بھی کام لیتے ہیں۔ "سفارش" ڈائری میں بار بار

استعمال ہونے والے الفاظ میں سے ایک ہے۔

یہ ڈائری ظاہر کرتی ہے کہ کانپور کے مسلمان اس وقت کس قدر مشکل دور سے گزر رہے تھے۔ مارچ ۱۹۴۷ سے شہر میں مسلسل پر تشدد واقعات جاری تھے۔ مارچ میں، حسرت نے مسجدوں کے باہر مسلح محافظ تعینات کیے۔ اپریل میں انھوں نے اُن مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی جو ایک مخصوص محلے میں محصور ہیں، مگر ضلع کمشنر انہیں روک دیتا ہے۔

اپریل ہی میں، وہ راشن آفس کو اس لیے منتقل کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو راشن لینے کے لیے ایک سکھ گردوارے کے سامنے سے نہ گزرنا پڑے۔ یہ ایک دانشمندانہ اقدام تھا۔ وہ بار بار کانپور جیل کا دورہ کرتے ہیں کیونکہ اس وقت بغیر کسی قانونی کارروائی کے بڑی تعداد میں لوگوں کو قید کیا جارہاہے۔

اگست میں، وہ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ۱۵/ اگست کو ہر شخص کو لائٹیں جلانے اور قومی پرچم لہرانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ بات خاصی دلچسپ ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ انہوں نے یہ سوچا بھی یا یہ کہ یہ ایک مسئلہ بن گیا تھا؟ اگست اور ستمبر میں، کانپور میں کرفیو نافذ ہے، جس سے سب کی زندگی شدید متأثر ہو رہی ہے۔ وہ اُن مسلمانوں کی مدد کی کوشش کرتے ہیں جن کے اسلحے کے لائسنس چھین لیے گئے تھے۔ معزز سابق مسلمان چیف انسپکٹر جیسے لوگ شکایت کر رہے ہیں کہ ان کی پستولیں لے لی گئی ہیں۔ اور حسرت، چیف منسٹر جی بی پنت سے ملنے جاتے ہیں تاکہ یہ مسئلہ حل کرسکیں۔

اکتوبر میں، بلاک پرنٹرز یونین کے اراکین نے درخواست کی کہ انہیں کانپور میں ہی رہنے دیا جائے کیونکہ وہ اب اپنے گاؤں میں خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتے۔ ویسے بھی، کانپور خود کافی غیر محفوظ تھا، تو ان کے گاؤں کی حالت کیسی ہو گی، اس کا کسی کو واقعی اندازہ نہیں۔

اکتوبر میں، کلکٹر نے کانپور کے تمام مسلم ہوٹل بند کروادیے۔ اور مجھے شبہ ہے کہ یہ اس وجہ سے ہوا کیونکہ مسلم ہوٹل گائے کا گوشت یا دیگر اقسام کے گوشت فراہم کرتے تھے۔ اس وقت تک، میونسپل بورڈ ہندو اکثریت کے زیرِ اثر آچکا تھا، اور انہوں نے اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اس عمل کو روکنے کا فیصلہ کیا۔

دسمبر میں، حسرت نے اردو اساتذہ کو خوش آمدید کہا جنہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اب وہ اردو

اسکول بند کر دیں اوران کی جگہ ہندی اسکول چلائیں۔ یہ فیصلہ یو پی حکومت کی طرف سے ایک من مانی کارروائی کا نتیجہ تھا۔ اور ظاہر ہے، ایک لحاظ سے حسرت ہی وہ شخص تھے جن سے رجوع کیا جانا چاہیے تھا، کیونکہ کوئی بھی شخص اردو کے بارے میں ان سے زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ لیکن وہ اسمبلی میں معاملات درست کرنے کے شاید اہل نہ تھے۔

سنہ ۱۹۴۸ میں، کانپور میں مسلمانوں پر دباؤ کچھ کم ہوتا محسوس ہوا۔ لیکن ۳ جولائی ۱۹۴۹ کو، حسرت نوٹ کرتے ہیں کہ، ایک نئی سڑک کی تعمیر کے سلسلے میں، کلکٹر کے حکم پر تمام مسلم دکانیں ہٹادی گئی تھیں اور وہ سندھ سے آئے ہوئے ہندو مہاجرین کو دے دی گئی تھیں۔ ان کی ڈائری دہلی میں اور عمومی طور پر مسلمانوں کی بدلی ہوئی حیثیت کو بھی بیان کرتی ہے۔

۱۷ نومبر ۱۹۴۷ کو، حسرت لکھتے ہیں کہ کرفیو کی وجہ سے وہ کانپور سے دہلی جانے کے لیے غازی آباد میں ٹرین سے اتر کر ایک لاری کے ذریعے سفر کرنے پر مجبور ہوئے۔ جو لوگ لکھنؤ سے دہلی گئے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ یہ کوئی خاص مشکل بات نہیں۔ لیکن، وہ کہتے ہیں: ''ایک حقیقی خطرے کا احساس تھا کیونکہ جہاں بھی نظر جاتی، کوئی مسلمان دکھائی نہیں دیتا تھا''۔ اگرچہ وہ کرفیو توڑ کر لاری سے سفر کر رہے تھے پھر بھی خود کو بے حد غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔

۲۴ نومبر ۱۹۴۷ کو وہ نوٹ کرتے ہیں کہ 'چاندنی چوک اجنبیوں کے قبضے میں ہے۔ ایک مسلمان وہاں جانے کی سوچ بھی نہیں سکتا'۔ میری سمجھ کے مطابق، آزادی سے پہلے یہ علاقہ غالباً ایک بڑا مسلم علاقہ رہا ہو گا۔ لیکن اب یہ مکمل طور پر اُن لوگوں کے قبضے میں ہے جو اُس علاقے سے آئے ہیں جو اب پاکستان کہلاتا ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۴۷ کو، دہلی سے غازی آباد جاتے ہوئے جب وہ ایک لاری میں سوار ہوتے ہیں تو نوٹ کرتے ہیں کہ لاری پانچ مرتبہ روکی گئی، لیکن صرف مسلمانوں کی تلاشی لی گئی، کسی اور کی نہیں۔

۵ دسمبر ۱۹۴۷ کو، وہ لکھتے ہیں کہ 'نئی دہلی میں ایک بھی مسلمان چہرہ نظر نہیں آتا'۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی مسلمان چہرہ ہندو چہرے سے کیسے پہچانا جا سکتا ہے۔ شاید انھوں نے کپڑوں سے اندازہ لگایا ہو۔ بہر حال، وہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ نئی دہلی میں ایک بھی مسلمان چہرہ نظر نہیں آتا۔

۲۳ جنوری ۱۹۴۸ کو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے پرانی دہلی میں صرف ایک مسلمان کو دیکھا۔

اگر آپ ان شہروں کی تاریخ کو مدنظر رکھیں، تو یہ ایک حیران کن بات ہے۔

۵ فروری ۱۹۴۸ کو، وہ لکھتے ہیں 'میں حکومت کے مسلمانوں کے بارے میں اصل ارادے دیکھ رہا ہوں' کیونکہ دوران سفر حسرت دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ اور اس سے آگے جانے والی ٹرین میں سوار مسلمانوں سے، جنہوں نے اپنے ٹکٹ خرید رکھے ہیں، سفر جاری کرنے کے لئے پولیس اور ریلوے کے اہلکار زبردستی اضافی رقم وصول کرتے ہیں۔

۱۹ فروری ۱۹۴۷ کو، وہ کہتے ہیں: 'اب بلی ماران اور گلاب پور میں کوئی مسلمان ہوٹل باقی نہیں رہا'۔ جو لوگ دہلی کو جانتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بلی ماران وہ جگہ ہے جہاں سر سید احمد خان نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ دراصل مغل سلطنت کے آخری وزیر بھی وہیں کے تھے، کیونکہ وہ سر سید احمد خان کے نانا تھے۔ حسرت یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں اپنی پسندیدہ نہاری اور روٹی حاصل کرنے میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔

۲۳ فروری ۱۹۴۷ کو حسرت اپنی ڈائری میں مسلم دنیا کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات کہتے ہیں: 'میں حضرت نظام الدین کے عرس پر قل میں شریک ہوا، میں اس میں پوری طرح محو ہو گیا۔ اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ کوئی طاقت مسلم تاریخ اور ثقافت کو دہلی سے ختم نہیں کر سکتی۔ باوجود اس کے کہ پچھلے ۱۸ مہینے کافی مشکل رہے ہیں'۔ بہرحال ان تجربات کے بعد یہ اُن کا تاثر تھا۔

پھر جون ۱۹۴۷ سے، حیدرآباد کی قسمت مسلمانوں کی حالت کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ اور ۱۶ جون ۱۹۴۷ کو وہ لکھتے ہیں کہ 'آج حیدرآباد کے بارے میں ایک بیان آنے والا ہے۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ حیدرآباد کی آزادی کا احترام کیا جائے'۔ ہندوستان کے اقدامات کے خلاف ذاتی احتجاج کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ 'اب وہ پارلیمنٹ میں اپنی تقریروں میں کوئی ہندی لفظ استعمال نہیں کریں گے'۔ حسرت کی جانب سے ایک روایتی انداز کی مزاحمت تھی۔

جون سے اگست ۱۹۴۸ تک، اُن کی ڈائری حیدرآباد کے بارے میں تبصروں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ایک دلچسپ بات وہ یہ بتاتے ہیں ہے کہ وہ وائرلیس (ریڈیو) پر حالات وواقعات سن رہے ہیں۔ یہاں اچانک "وائرلیس" خبروں کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ کو، وہ نوٹ کرتے ہیں کہ نظام حیدرآباد نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ وہ کہتے

ہیں کہ شاید ایسا اس لیے ہوا ہے کیونکہ نظام کو شیعیت سے شغف ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ ٹیپو سلطان کے ساتھ کی غداری کا بدلہ ہے۔ ان کے دماغ میں دلچسپ باتیں چل رہی ہیں۔ بہر حال، وہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ پیش رفت انگریزی زبان کے پرفیکٹ (perfect) زمانے کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

اس کے بعد، حسرت ہمیں بتاتے ہیں کہ حیدرآباد کے ہندوستانی وفاق میں انضمام کے بعد کیا اثرات مرتب ہوئے۔ فرنگی محل کے لوگ اس بات سے بہت پریشان ہیں کہ کہیں حیدرآباد سے ملنے والی گرانٹ بند نہ ہو جائے جس سے مدرسہ چلانے میں مدد ملتی ہے۔ حقیقت میں، حسرت قطب میاں کو، جو مدرسے کے نگراں ہیں، اپنی پنشن سے پیسے دینا شروع کر دیتے ہیں تاکہ مالی فرق کو پورا کیا جاسکے۔ وہ انہیں تقریباً ایک ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں، جو اس وقت ایک بڑی رقم تھی۔ اور ظاہر ہے، حالانکہ کہانی کا یہ ایک الگ حصہ ہے، جمال میاں کو ڈھاکہ جانا پڑتا ہے تاکہ کوئی روزگار حاصل کرسکیں اور مدرسہ وفرنگی محل کی مدد کرسکیں۔

پھر ڈائری میں حیدرآباد کے مسلمانوں پر انضمام کے اثرات بھی بیان کیے جاتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ شمالی ہندوستان منتقل ہو رہے ہیں، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، بہت سے پاکستان چلے گئے۔ جب وہ منتقل ہوتے ہیں، خاص طور پر اگر وہ ٹرین کے ذریعے سفر کرتے ہیں، تو حسرت نوٹ کرتے ہیں کہ اُنہیں ٹرین کے سفر میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں۔ وہ کئی واقعات کا ذکر کرتے ہیں جن میں حیدرآباد سے آنے والی ٹرینوں سے تمام مسلمانوں کو اتار لیا گیا، اُن کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا اور تلاشی لی گئی۔ مگر حسرت یہ نہیں بتاتے کہ کیا اُنہیں لوٹا بھی گیا۔ البتہ وہ اس بات کا اشارہ ضرور دیتے ہیں کہ لوٹے جانے کا موقع وہاں موجود تھا۔

۲۲ر اگست ۱۹۴۹ کو حسرت اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ حیدرآباد سے ایک شخص ان کے پاس آیا ہے جو ان کے یہاں قیام پذیر ہے، اور وہ حیدرآباد کے ہندوستانی وفاق میں انضمام کے مسلمانوں کی نفسیات پر اثرات کے بارے میں بات کر رہا ہے...... اسی دوران جب حسرت حیدرآباد میں ہونے والے حالات کو نوٹ کر رہے تھے، وہ اتر پردیش (یوپی) میں اردو کی بقاء اور ہندوستانی آئین میں اس کے کردار کے لیے بھی جدوجہد کر رہے تھے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اردو کو ہندوستانی آئین میں ایک سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ لیکن اس سلسلے میں اُن کی ڈائری کے دو بیانات خاص

طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) ۱۲/ اکتوبر ۱۹۴۸ کو، جب وہ یوپی کی قانون ساز اسمبلی جارہے تھے، توانہوں نے لکھا کہ پورا ایجنڈا سنسکرت زدہ ہندی کے فروغ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ حسرت نوٹ کرتے ہیں کہ یوپی اسمبلی کی دیواروں پر آویزاں فارسی اشعار کو ہٹا دیا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا: 'ایسی تنگ نظر حکومت قانون سازی نہیں کرسکتی'۔ یہ بات دلچسپ ہے کیونکہ جمال میاں نے کانگریس میں موجود کچھ ہندو رہنماؤں، جیسے پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کمال کی فارسی بولتے تھے، اور اسمبلی میں اپنی تقریروں کے دوران اشعار کا استعمال بہت مؤثر انداز میں کرتے تھے۔ لہٰذا پہلا اہم واقعہ یوپی اسمبلی سے فارسی اشعار کو ہٹائے جانے کا ہے۔

(۲) ۲۷ جون ۱۹۴۹ کو حسرت اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی قسمت میں یہ دکھ بھی دیکھنا تھا جب انہیں صرف ہندی اخبار نظر آرہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نہ اردو اخبار مل سکا اور نہ انگریزی، صرف ہندی اخبار دستیاب تھا۔ اور اس زمانے میں مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے اپنے اخبار "ہمدم" کے لیے ایک نظم کہی، جو ہندی اور دیوناگری رسم الخط کے مسلط کیے جانے پر لکھی گئی تھی۔

مسلمانوں کو درپیش تجربات میں تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان کے قیام کے بعد ان کی نمائندگی کیسے ہونی چاہیے۔ اور یہ سوال ایسے وقت میں اٹھا جب مسلمان اپنے اقتدار کے زوال اور ہندوستانی سماج میں اپنی ثقافت کی گرتی ہوئی حیثیت کا سامنا کر رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ: "ہم اپنے مفادات کی نمائندگی کیسے کریں؟"

جولائی ۱۹۴۷ میں، حسرت اس بات پر مصر ہیں کہ مسلمانوں کو آزاد ہند پارٹی یا سبھاش چندر بوس کے فارورڈ بلاک کے کسی اور دھڑے میں شامل ہونا چاہیے۔ لیکن جناح ہمارے پاس بات کرنے نہیں آئے جبکہ ہم اس اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جواب دے دیا کہ "وہ بہت مصروف ہیں"۔

پروفیسر رابنسن تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ جناح واقعی بہت مصروف ہوں، لیکن پاکستان کے قیام کے بعد مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کوئی غیر اہم مسئلہ نہیں تھا... مولانا جمال

میاں، جو جناح کے بڑے مداح تھے، جناح پر ان کی سب سے بڑی تنقید یہی تھی کہ جناح نے تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل میں خاطر خواہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور اس موقع پر بھی، وہ ان کی رہنمائی کے لیے نہیں آئے۔

ستمبر ۱۹۴۷ میں مسلم لیگیوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی سوشلسٹ پارٹی یا سوشلسٹ اتحاد میں شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ ایسا کرنا ان کے عقائد کے خلاف تھا۔ مگر حسرت کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو مذہبی جماعت کے تصور کو چھوڑ کر سوشلسٹ پارٹی تشکیل دینی پڑے گی، یا ان کی رائے میں سوشلسٹ پارٹی ہی ان کے لئے واحد راستہ ہے۔

اس وقت تک قیادت کا شدید فقدان ہو چکا تھا کیونکہ خلیق الزماں، جنہیں جناح نے پاکستان جانے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا قائد مقرر کیا تھا، خود پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ اور دسمبر ۱۹۴۷ تک جناح نے مدراس سے تعلق رکھنے والے محمد اسماعیل کو ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کی ذمہ داری سونپ دی۔ شاید یہ کوئی اچھا فیصلہ نہیں تھا کیونکہ ایک مدراسی مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں کے مسائل اور ان کے تجربات کو صحیح طرح نہیں سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ کے آخر تک یہ بات طے نہیں ہو سکی تھی کہ آئندہ کس راستے کا انتخاب کیا جانا چاہئے۔

۲ دسمبر ۱۹۴۷ کو مولانا ابوالکلام آزاد لکھنؤ کے ایک ہوٹل میں مسلم لیگی قیادت سے خطاب کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کو تمام مسلم اداروں کو ترک کر کے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لینی چاہیے۔ مگر مسلم لیگی گروہ، جس نے اپنی زیادہ تر زندگی کانگریس کے خلاف جدوجہد میں گزاری ہے، اس مشورے میں کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کرتے۔

۱۰ مارچ ۹۴۸ کو مدراس کانفرنس میں، جو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے مستقبل پر غور کے لیے منعقد کی گئی تھی، محمد اسماعیل یہ واضح کرتے ہیں کہ مسلم لیگ قائم رہنی چاہئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان کی صورتحال سے کس قدر بے خبر تھے۔ لیکن وہاں موجود اکثریت یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو صرف ایک سماجی اور سیاسی جدوجہد کی جماعت کے طور پر منظم کیا جائے۔ اور مارچ ۱۹۴۸ میں یوپی مسلم لیگ کی قیادت بھی اسی موقف کی تائید کرتی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنے مفادات کی نمائندگی کے لیے کس قسم کی تنظیمیں اختیار کرنی چاہییں، حسرت کی ڈائری ہمیں

اس بحث کے صرف اس مرحلے تک ہی بتاتی ہے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ ایسا مسئلہ ہے جو مکمل طور پر کبھی ختم نہیں ہوا، بلکہ آج تک کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ حسرت ایک ادیب، اخبار کے مالک اور شاعر کے طور پر یہ واضح کرتے ہیں کہ اخبارات ان کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتے تھے۔ تین برسوں کے دوران وہ درج ذیل ہندوستانی اخبارات کا ذکر کرتے ہیں: وحدت، دی پاینیر، دی پیپلز ایج، دی اسٹیٹس مین، ہمدم، الامان، نیو ایج، انجام، مدینہ، قومی آواز، ہندوستان ٹائمز، قومی اخبار، دی لیڈر اور زمیندار۔ یہ اخبارات کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ ان میں سے کئی اخبارات سنجیدہ نوعیت کے تھے۔ پاکستانی اخبارات میں وہ درج ذیل کا ذکر کرتے ہیں: ڈان، انقلاب، زمیندار، سیاست لاہور اور قاضی۔ حسرت کا ہر دن اس طرح شروع ہوتا تھا کہ وہ کئی اخبارات پڑھتے تھے۔ مثلاً جب وہ صبح سویرے کانپور سے لکھنؤ پہنچتے تو فوراً فرنگی محل یا شبلی بک اسٹور چلے جاتے تاکہ اخبارات پڑھ سکیں۔ جمال میاں کہتے ہیں کہ جب حسرت اخبار میں محو ہوتے تو ان سے بات کرنا ناممکن ہوتا، اور اگر کوئی مخاطب کرتا تو بس ان کا جواب صرف 'ہوں' میں ہوتا تھا۔

سفر کے دوران حسرت اکثر اخباری دفاتر میں قیام کرتے۔ دہلی میں وہ وحدت اور الامان، لاہور میں زمیندار اور سیاست کے دفاتر میں ٹھہرتے۔ اور یہ تقریباً یوں تھا جیسے اخبار کے مدیران کے درمیان ایک خاص قسم کی اخوت پائی جاتی ہو، اور ہر ایک دوسرے اخبار والوں کو سفر میں سہولت دیتا ہو۔

حسرت اپنے پرانے اخبارات سنبھال کر رکھتے۔ ان کے اخبار کبھی بھی ردی میں نہیں جاتے تھے۔ ان کی ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر سال گزشتہ برس کے اخبارات جلد بند کر کے محفوظ کر لیتے تھے۔ یہ کافی دلچسپ بات ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک یہ کاغذ کوئی معمولی چیز نہیں تھا کہ بس پھینک دیا جائے یا اسے 'فش اینڈ چپس' لپیٹنے کے کام میں لایا جائے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ ان کی تقاریر اخبار میں شائع ہوئی یا نہیں، اور وہ اپنی نظمیں بھی اکثر اخبارات کو اشاعت کے لیے دیتے تھے۔ مگر ڈائری میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے یہ لگے کہ وائرلیس جو ان کے کانپور والے گھر میں خبروں کے ذریعہ کے لئے موجود تھا، اس نے اخبار کی جگہ لی ہو۔ حیدرآباد اور کشمیر سے متعلق خبریں وہ وائرلیس پر سنتے تھے اور غیر دانشمندانہ طور پر کبھی کبھار

پاکستانی نشریات بھی سن لیتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے وائرلیس پر پٹیل کے ہاتھوں وشاکھاپٹنم میں ایک بحری جہاز کے افتتاح کرنے کی خبر سنی۔ مگر ان کے لئے اخبار سب کچھ تھا۔

حسرت کی ادبی مصروفیات: اس ڈائری میں اُن کی شاعرانہ مصروفیات کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ دوسرے شعرا کے اشعار کی اصلاح کر رہے ہیں۔ آپ انہیں ریڈیو کے لیے اشعار لکھتے اور آل انڈیا ریڈیو پر کئی بار انہیں پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ آپ انہیں اپنی شاعری کے مجموعے اشاعت کے لیے ترتیب دیتے، مشاعروں میں شریک ہوتے اور مختلف شعرا سے ملاقات کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس طرح آپ کو ایک محنتی شاعر کی عملی زندگی کا حقیقی اندازہ ہوتا ہے۔

حسرت کے خواب اور روحانی سلسلہ: اب میں حسرت کی روحانی اور خوابوں کی دنیا کی طرف آتا ہوں۔ حسرت ایک پکے صوفی تھے اور وہ فرنگی محلی روایت سے وابستہ تھے۔ ان کے پہلے پیر مولانا عبد الباری کے والد عبد الوہاب تھے۔ وہ ہر سال موہان میں اپنے خاندان کے عرس میں بھی شریک ہوتے۔ اس کے علاوہ وہ مکمل طور پر فرنگی محلی طرز پر چلتے تھے، سوائے ایک استثنا کے جس کا میں ذکر کروں گا۔ وہ فرنگی محل کے بزرگوں عبد الولی، عبد الوہاب، اور عبد الباری کے عرس میں شریک ہوتے۔ وہ بانسہ کے سید شاہ عبد الرزاق کے عرس میں بھی جاتے، جنہیں فرنگی محلی کئی نسلوں سے اپنی خوش بختی کا مرکز سمجھتے تھے۔ اور وہ اودھ کے معروف بزرگ احمد عبد الحق ردولوی کے عرس میں بھی شریک ہوتے۔ جمال میاں نے ان کے سجادہ نشین کی بڑی بیٹی سے شادی کی۔ جمال میاں کی طرح وہ بھی خواجہ معین الدین چشتی کے عرس میں اجمیر شریف جاتے تھے اور درگاہ کے متولیوں میں شامل تھے۔ لہٰذا، زیادہ تر اُن کی روحانی زندگی مکمل طور پر فرنگی محل کے طریقے پر مبنی تھی۔

یہاں پر ایک اور دلچسپ نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ حسرت کی شاعری سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی بہت سی نظموں میں کرشن سے اپنی محبت کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جنم اشٹمی میں شرکت کرنے کے لئے ہر سال متھرا جایا کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں ایسا کرتے تھے۔ مگر مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ اس ڈائری میں وہ کرشن کی جنم اشٹمی میں شرکت کا ایک مرتبہ بھی ذکر نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندو احیا پرستی نے ان کا نظریہ بدل دیا ہو۔ حالانکہ اس بات کا احتمال کم ہی ہے، لیکن ایسا ہونا ممکن ہے۔ بہر حال ایسا لگتا ہے کہ وہ جنم اشٹمی

میں شرکت چھوڑ چکے تھے۔ اس کے برعکس حسرت عرس میں شرکت کا خوب ذکر کرتے ہیں۔

جون ۱۹۴۸ میں، فرنگی محل باغ میں قوالی کے بعد، انہوں نے تبصرہ کیا کہ عربی زبان نے وہاں موجود لوگوں کے دلوں میں عشق نبی کا جذبہ پیدا کر دیا...... جون ۱۹۴۹ میں، انہوں نے لکھا کہ: ”میں فرنگی محل عرس میں شرکت کے لئے کسی طرح لکھنؤ وقت پر پہنچ گیا کیونکہ روحانی لحاظ سے یہ میرے لئے بہت اہم ہے“ اور آپ کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ فرنگی محل کے عرس میں قوالی کے دوران حسرت کی لکھی ہوئی کئی نعتوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ ان کی روحانی زندگی ہے۔ لیکن ان کے خوابوں کی زندگی بھی ہے۔ اور جمال میاں کی طرح، حسرت بھی اپنے خوابوں کو لکھتے ہیں۔ مجھے اس بات پر تو شبہ ہے کہ وہ تمام خواب لکھتے ہوں گے، مگر کم از کم کچھ تو ضرور لکھے ہیں۔ ۲/اپریل ۱۹۴۷ کو وہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کا بوسہ لینے کے لیے دوڑتے ہیں۔ نبیؐ نے مسکرا کر کچھ نصیحت دی۔ مگر وہ لکھتے ہیں کہ نصیحت وہ یاد نہیں رکھ پائے۔

۱۲/اکتوبر ۱۹۴۸ کو انہیں خواب آیا کہ وہ کانپور کے سیاسی رہنما ذاکر علی سے ملے، اور وہ دونوں جواہر لال نہرو کے ساتھ تھے۔ درحقیقت، جواہر لال نہرو کا کردار جمال میاں کے خوابوں میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ بہت دلچسپ ہے۔ ۲۱/اگست ۱۹۴۹ کو حسرت نے نوٹ کیا کہ ’رات کے درمیان مجھے محسوس ہوا کہ میں نبی کریم ﷺ کے دربار میں حاضر ہوں اور میں نے حج بھی کیا ہے۔ یہ ایک بہت زبردست احساس تھا‘۔ جاگنے کے بعد حسرت نے ایک غزل لکھی۔

۷/اکتوبر ۱۹۴۹ کو حسرت نے خواب میں اپنی دادی کو دیکھا جو ان کے لیے کچھ پکا کر لا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے جناح صاحب کو دیکھا جو بازار جا رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ بازار گئے اور ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ انہوں نے اس خواب کی تعبیر یہ کی کہ وہ مسلمانوں کے لیے اچھے کام کر رہے ہیں اور جناح ان سے خوش ہیں۔ ۸/اکتوبر ۱۹۴۹ کو انہوں نے خواب میں نہرو کو دیکھا۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۴۹ کو انہوں نے خواب میں حیدرآباد کے نظام کو دیکھا جو ہندوستانی پارلیمنٹ کے ارکان سے خطاب کر رہے تھے۔ ۱۶/نومبر ۱۹۴۹ کو ایک دل کو چھو لینے والے خواب میں وہ اپنی پہلی بیوی بیگم حسرت موہانی کو دیکھتے ہیں جو ان کو انار دے رہی تھیں۔ اگلے دن ان کی وفات کی برسی تھی۔

ڈائری میں کچھ متفرقات: آخر میں کچھ عجیب دلچسپ باتیں بھی ہیں۔ ان کی ڈائری میں،

نہ آزادی کے دن کا اور نہ اس کے آس پاس کے دنوں کا کوئی ذکر ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کیونکہ آزادی ایک بہت بڑا واقعہ تھا، جس کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے اس کا ذکر صرف اس وقت کیا جب وہ کانپور کے شہریوں کی مدد کر رہے تھے۔ انہوں نے گاندھی کی وفات پر غم کا اظہار کیا اور جناح کی حصولیابیوں کی تعریف کی۔ بلکہ دونوں کی موت پر ان کی تعریف کی۔

وہ ہمیشہ قومی اور یوپی اسمبلی سے اپنا حاضری الاؤنس لیتے ہیں اور وہ بالکل ہاؤس آف لارڈز کے رکن کی طرح ہیں۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ یہ تفصیلات لکھتے ہیں کہ انہوں نے الاؤنس کب لیا اور کب اسے بینک میں جمع کروایا۔ جتنا زیادہ ہو سکے وہ پیٹرول کے کوپن حاصل کر کے خوش ہیں جو راشن سے مل رہا تھا۔ حالانکہ ان کے پاس گاڑی نہیں تھی، تو انہیں پیٹرول کوپن کی ضرورت کیوں؟ لیکن ظاہر ہے یہ کوپن ایک خاص قسم کی کرنسی کی حیثیت رکھتے تھے۔

پارلیمنٹ میں ان کا ایک بڑا مسئلہ اردو کی حفاظت تھا، جس پر وہ پہلے سے زور دیتے آئے تھے۔ ۱۹۴۷-۱۹۴۹ء کے دوران حسرت اکثر بیمار رہتے تھے۔ ممکنہ طور پر ان کا پروسٹیٹ بڑھا ہوا تھا اور انہیں معدے کے مسائل بھی تھے۔ وہ اکثر مغربی دواؤں کے ساتھ ساتھ یونانی دوائیں بھی لیتے تھے۔ حالانکہ جمال میاں کے دوست ڈاکٹر فریدی انہیں مشورہ دیتے تھے کہ ایسا کرنا بہت احمقانہ بات ہے۔ لیکن یہ دلچسپ بات ہے کہ لوگ جتنا زیادہ ممکن ہو دوا لیتے ہیں، اس امید پر کہ شاید ان میں سے کوئی تو اثر کرے۔

۹/جون ۱۹۴۹ کو حسرت نوٹ کرتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں کنگ جارج ششم کی سالگرہ کے موقع پر تعطیل تھی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ۱۹۴۹ میں جارج ششم اگلے سال جنوری میں جمہوریہ قائم ہونے تک ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ حسرت، جو برطانوی حکومت اور بادشاہت کے سخت مخالف تھے، اس بات کا ذکر مختصراً کرتے ہیں اور کوئی سخت ردعمل ظاہر نہیں کرتے۔

حسرت کی ڈائری ہمیں ۱۹۴۷ سے ۱۹۴۹ کے مشکل سالوں کے روزمرہ واقعات سے جوڑتی ہے۔ جمال میاں کی ڈائری کی طرح یہ بھی کوئی ادبی ڈائری نہیں ہے، لیکن اس سے ایک تاریخ داں کو یہ سمجھنے میں بہرحال مدد کرتی ہے کہ کسی اور مقام پر کسی اور وقت میں ایک انسان ہونے کے کیا معنی تھے۔ ممکن ہے کہ اس ڈائری کی مزید جلدیں بھی مل جائیں۔

مثنوی ''سَیفُ الملوک وبدیعُ الجمال'' کا اَدبی وتہذیبی مطالعہ

آصف مبین
ریسرچ اسکالر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
asifmubeen11@gmail.com

اِس مضمون سے دکن کے ملک الشعراء غوّاصی کی مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کا اَدبی وتہذیبی مطالعہ وجائزہ مقصود ہے۔ میر سعادت علی رضوی اورڈاکٹر محمد علی اثرؔ نے کتاب ''غوّاصی: شخصیت اور فن'' میں، اِس پہلو سے عمدہ بحث کی ہے۔ یہاں کچھ نئے پہلوؤں کی تلاش کی گئی ہے۔

غواصی کے حالات: دکنی شعرا کی ابتدائی زندگی، تعلیم وتربیت وغیرہ کے بارے میں عام طور پر کم معلومات ہیں۔ دوسرے شعراء کی طرح غوّاصی کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس کے شاگرد تھے؟ تھے بھی یا نہیں؟۔ سعادت علی رضوی لکھتے ہیں:

> غوّاصی کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا ہوگا اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شاعری شروع کی ہوگی[1]۔
> غواصی نے اپنی تصانیف میں کسی ہمعصر شاعر کا ذکر کیا ہے نہ متقدمین کا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو فنِ شعر میں کس قدر اعلیٰ اور اکمل سمجھتا تھا۔ اس واقعہ سے ایک مبہم قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس نے کسی کی شاگردی نہیں کی[2]۔

ڈاکٹر قیوم صادق ''دکنی ادب'' میں لکھتے ہیں:

> (غوّاصی) بیدر کا رہنے والا تھا۔ اُس نے وہیں ہوش سنبھالا، وہیں شاعری شروع کی، وہیں ایک بزرگ سے بیعت کی۔ سلطنتِ بیدر پر اِدبار آیا تو وہ گولکنڈہ چلا آیا۔[3]۔

---

[1] میر سعادت علی رضوی، مرتب: سیف الملوک وبدیع الجمال، مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدرآباد، سلسلۂ یوسفیہ شمارہ ۶، ۱۳۵۷ھ، ص ۱-۲۔

[2] ماخذ سابق، ص ۸۔

[3] قیوم صادق، دکنی ادب، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، ۱۹۸۸ء، ص ۹۸۔ جمیل جالبی کے بیان سے اتنا اور معلوم

اِبراہیم قطب شاہ کے بعد محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ غواصی نے عمر کا آخر حصہ گوشہ نشینی میں گذارااور دربار کی رونق سے دور رہا۔ سعادت علی رضوی کا بیان ہے:

غوّاصی نے جس طرح طوطی نامہ (سنہ تصنیف ۱۰۴۹ھ) کے آخر میں تارک الدنیا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسی طرح عمل بھی کیا، اسی لیے اس کی آخری زندگی بالکل گمنام ہے یہاں تک کہ تاریخِ وفات کا بھی علم نہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ اس کا سُلطان عبداللہ ہی کے زمانے میں انتقال ہوا ہوگا[۴]۔

غواصی کی شاعری: ڈاکٹر غلام عمر خاں مرتب 'مینا ستونتی' نے غواصی کے احوال میں اس کی شعری خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً:

غواصی، وجہی اور محمد قلی (قطب شاہ) کے مقابلہ میں کم عمر تھا... محمد قطب شاہ کے عہد حکومت میں سنہ ۱۶۱۶ء یا سنہ ۱۶۱۸ء میں اس نے مثنوی سیف الملوک تصنیف کی۔... پھر سنہ ۱۶۲۵ء میں جب عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو غواصی نے نوجوان بادشاہ کے مذاقِ شعر وادب کے پیشِ نظر، اس مثنوی میں محمد قطب شاہ کی بجائے سلطان عبداللہ کی مدح میں اشعار شامل کرکے اُسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس کی سرپرستی کی اور وہ دربارِ شاہی سے متعلق ہوگیا۔ بادشاہ نے غالباً اسے "فصاحت آثار" کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ کلیاتِ غواصی کے ایک قصیدے میں ایک جگہ یہ واضح اشارہ ملتا ہے:

ہزار شکر جو خوش ہوکے یو شہِ عارف خطاب منج کو دیا ہے فصاحت آثاری[۵]

عبداللہ قطب شاہ نے غواصی کو سفیر بناکر بیجاپور بھیجا۔ وہاں غواصی نے اپنے کمال فن کا جس عمدگی سے مظاہرہ کیا، اس کی وجہ سے بیجاپور کے ملک الشعراء نصرتی اور مقیمی نے اس کا ذکر احترام وعقیدت کے ساتھ کیا۔

غواصی کے شعری موضوعات کے ذکر میں لکھا گیا:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غواصی کو طبعاً صنفِ نازک کے مسئلے سے کچھ خصوصی دلچسپی تھی۔ اُس کا قلم

ہوتا ہے کہ: "غواصی پیشے کے اعتبار سے سپاہی تھا اور رات کے وقت پہرے پر مامور تھا" (تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، ص ۴۷۲)۔

(۴) سعادت علی رضوی، مرتب: سیف الملوک وبدیع الجمال، ص ۵-۶۔

(۵) غلام عمر خاں، مرتب: میناستونتی، عثمانیہ یونیورسٹی (سلسلہ مطبوعاتِ قدیم اُردو)، حیدرآباد، ۱۹۶۵ء، ص ۵-۶۔

اِس موضوع پر خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ شوخ و شنگ حسیناؤں کی عیاریاں اور اُن کے مکروفریب، آشفتہ دل عاشقوں کی وارفتگی، پاکدامن عورتوں کی عفّت کوشیاں، کٹنیوں کی پرفریب کوششیں[۶]۔

غواصی نے مثنوی "سیف الملوک وبدیع الجمال" محمد قطب شاہ کے زمانے ہی میں مکمل کرلی تھی، لیکن قطب شاہ کی خشک طبیعت کی وجہ سے وہ نمایاں مرتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ اس بات کا ذکر کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد قطب شاہ علم وادب کی چاشنی اور زبان وادب کی سرپرستی سے محروم تھا۔ حالانکہ جمیل جالبی کا بیان کچھ اور ہے:

(محمد قلی قطب شاہ) کے مرنے کے بعد ۱۰۲۰ھ /۱۶۱۱ء میں اُس کا بھتیجا اور داماد محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ ۱۰۳۵-ھ /۱۶۱۱ء-۱۶۲۵ء) بادشاہ بنا تو اُس نے بھی اِس روایت کو زندہ وبرقرار رکھا۔ وہ ایک نیک دل، شریف النفس اور مذہبی انسان تھا۔ اُس نے اپنے چچا کا کلیات مرتّب کیا اور اُس پر ایک طویل منظوم دیباچہ بھی لکھا۔ وہ خود بھی شاعر تھا اور ظِلّ اللہ تخلص کرتا تھا۔ فارسی شاعری اور مذہب وتاریخ کا دل دادہ تھا۔ کتابیں پڑھنے اور اُن پر اپنی رائے لکھنے کا اُسے خاص شوق تھا[۷]۔

پچاس ہزار اشعار پر مشتمل قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب کرنا، اُس پر ایک طویل اور منظوم دیباچہ لکھنا، فارسی شعر وادب کا دل دادہ ہونا؛ اِن سب باتوں سے "یبوست" والی بات محمد قطب شاہ کی ذات سے میل نہیں کھاتی۔ ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ بادشاہ کی نظر میں بوجوہ کوئی شاعر مرتبۂ اعتبار حاصل نہ کرسکا۔

سعادت علی رضوی کی باتوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ قلی قطب شاہ کے دور میں غواصی مشق وممارست کی حالت میں تھا، پختگی محمد قطب شاہ کے زمانے میں آئی اور شہرت وترقی عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں نصیب ہوئی، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ: "۱۰۱۸ھ /۱۶۰۹ء میں مُلّا وجہی نے قطب مشتری لکھی تو اُس وقت غواصی کی شہرت گولکنڈا میں اتنی پھیل چکی تھی کہ خود پسند وجہی کو غواصی کی ذات میں اپنا حریف نظر آنے لگا تھا"[۸]۔

---

(۶) غلام عمر خاں، مرتب: میناستونتی، ص ۸-۹۔

(۷) جمیل جالبی، تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل)، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۸۴، ۳۷۳-۳۷۴۔

(۸) جمیل جالبی، تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل)، ص ۴۷۱-۴۷۲۔

مثنوی قطب مشتری میں مُلّا وجہی کے مندرجہ ذیل شعر غواصی کی تعریض میں مانے گئے ہیں:

اگر غوطے لک برس غواص کھائے — تو یک گوہر اِس دھات اَمولک نہ پائے
یو موتی نہیں وو جو غوّاص پائیں — یو موتی نہیں وو جو کِس ہاتھ آئیں
غواصاں کِتے غوطے کھا کھائے کر — موے ہیں سو اس سمد میں آئے کر

اس لیے یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ غواصی کی شاعری قلی قطب شاہ کے دَور میں "حالتِ مشق" میں تھی۔ مُلّا وجہی جیسے مستند شاعر سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی مبتدی شاعر کا ذکر ایک ایسی تصنیف میں لائے گا، جو سلطانِ وقت کی خدمت میں پیش کی جانی ہو۔

مثنوی کی تصنیف: سعادت علی رضوی کے مطابق ۱۰۳۵ھ میں غواصی نے مثنوی کی تکمیل کی۔ تحقیق طلب صرف یہ ہے کہ یہ سلطان محمد (قطب شاہ) کے زمانے کی تصنیف ہے یا سلطان عبداللہ کے۔ نواب سالارجنگ کے کتب خانے کے ایک نسخے میں بادشاہ کی تعریف کے تحت پہلا شعر اس طرح ہے جو دوسرے کسی نسخے میں درج نہیں ہے:

سو سُلطان محمدؐ قطب شاہ گنبھیر — جگ آدھار ہے ہور جگ دستگیر

رضوی کے بقول، مذکورہ نسخے کے علاوہ باقی نسخوں میں "سلطان عبداللہ آفاق گیر" آیا ہے۔ اس کا حل انھوں نے اس طرح نکالا ہے کہ:

> سلطان محمدؐ کا انتقال ماہِ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ میں ہوا۔ اور اسی ماہ میں سلطان عبداللہ تخت نشین ہوا۔ غواصی نے جمادی الاول ۱۰۳۵ھ کے قبل ہی یہ کتاب ختم کرلی تھی۔ محرم سے جمادی الاول تک خواہ کسی ماہ میں لکھی ہو۔ اور اس کا منتظر تھا کہ دربار میں رسائی حاصل ہو اور وہ بادشاہ کے نام سے معنون کرکے خود پیش کرے۔ اسی آرزو میں سلطان محمد کا انتقال ہو گیا اور اسے موقع نہیں ملا۔ سلطان عبداللہ کے تخت نشین ہوتے ہی اُسے آثار و قرائن سے یہ محسوس ہونے لگا کہ بہت جلد وہ دربارِ شاہی تک پہنچ جائیگا پس اس نے سلطان محمد کا نام اشعار سے نکال کر سلطان عبداللہ کا نام لکھ دیا[9]۔

---

[9] سعادت علی رضوی، مرتب: سیف الملوک وبدیع الجمال، ص ۳۱-۳۲۔

قصّہ: "سیف الملوک وبدیع الجمال" کی کہانی عہدِ وسطیٰ کے عام موضوعات پر مشتمل ہے۔ یعنی گذشتہ زمانے کا ایک بادشاہ جو شومئ قسمت سے اولاد کا محتاج تھا۔ سلطنت کے نجومیوں نے بتایا کہ اگر وہ سلطانِ یمن کی بیٹی سے نکاح کرے تو گوہرِ مراد حاصل ہو۔ شادی ہوتی ہے، اولاد ہوتی ہے۔ لڑکے کا نام سیف الملوک رکھا جاتا ہے۔ قسمت سے وہ شہپال ابن شاہ رخ شاہِ جنّات کی بیٹی بدیع الجمال پر عاشق ہو جاتا ہے۔ بدیع الجمال تک پہونچنے میں ہزار آفتیں آتی ہیں۔ ہر بات میں نئی کہانی، ہر حلقے میں ایک نیا جال تیار ہوتا ہے۔ آخر، سیف الملوک وبدیع الجمال کی شادی ہوتی ہے اور قصّہ تکمیلِ مراد کے ساتھ سُننے اور پڑھنے والوں کی امیدوں کو زندہ رکھتا اور حوصلوں کو بڑھاتا اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

قصّے کا ماخذ: غوآصی نے مثنوی میں کہیں بھی قصّے کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن مثنوی کے مرتب سعادت علی رضوی لکھتے ہیں:

> یہ قصّہ الف لیلہ کے فارسی ترجمے کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ اس میں مصر کے شہزادہ سیف الملوک اور اجنّہ کی شہزادی بدیع الجمال کے حسن و عشق کی داستان مذکور ہے۔ غوآصی نے اسی فارسی نثر سے دکنی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد عہد اورنگ زیب عالمگیر میں مرزا بدیع اصفہانی نے شمشیر خاں کی فرمایش پر اس قصّے کو فارسی میں نظم کیا اور "گلدستۂ عشق" نام رکھا(۱۰)۔

نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ سلطان محمود غزنوی کی دلچسپی کے باعث وجود میں آیا۔

دکنی شعرا نے مثنویوں میں عموماً جدت، ندرت اور فنی ہنرمندی کا دعویٰ کیا ہے۔ غوآصی نے بھی کسی کسرِ نفسی سے کام نہیں لیا۔ سعادت علی رضوی نے ان دعوؤں پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے:

> غواصی کی تعلّی اور ہمہ دانی کا ثبوت اس وقت تک صرف دو کتابیں مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال اور طوطی نامہ ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ کوئی فیصلہ کن ثبوت نہیں کیونکہ یہ دونوں کتابیں اتفاق سے فارسی کے ترجمے ہیں کوئی اپجی تصنیف نہیں۔ ترجمے سے کسی شاعر کے قوتِ تخیل اور تصرفِ الفاظ کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا البتہ اس کی کہنہ مشقی ثابت ہوسکتی ہے(۱۱)۔

---

(۱۰) ماخذ سابق، ص۱۹۔

(۱۱) ماخذ سابق، ص ۸۔

قصّوں کی اُپج اور جدت جیسی تعلّیات کو لکیر سے ہٹ کر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ قصے اور روایتیں جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے ہوں، اُن میں جان راوی کے طریقے و طرزِ بیان سے پیدا ہوتی ہے۔ مثنوی "گلزارِ نسیم" اور "سحر البیان" کے قصے نامانوس نہیں تھے۔ ان کی دلکشی شعراء کے طرزِ ادا نے بڑھائی۔

مثنوی کے زبان واسلوب: گولکنڈہ کا ہونے کے باوجود غواّصی کی زبان پر دکنی وپراکرت الفاظ کا تناسب زیادہ ہے، رضوی لکھتے ہیں:

> غواّصی کے کلام میں دکنی الفاظ کا عنصر بہ نسبت فارسی کے بہت زیادہ ہے۔ بعض مقامات پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمداً دکنی لفظ استعمال کر رہا ہے۔ چنانچہ اسی نظم میں جو "تعریفِ سخن" کے عنوان کے تحت ہے وہ بجائے سخن کے 'بچن' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح جیو، جِیب، بھومان، جگت، گڑان، فام، رتن، کہان، بہان، وغیرہ دکنی الفاظ کی ہر جگہ بہتات ہے اور غواّصی بے تکلف استعمال کرتا چلا جاتا ہے[۱۲]۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ بیان بھی اہم ہے:

> دسویں صدی ہجری میں جب ہندوی اصناف کا رواج بیجاپور میں عام ہے، گولکنڈا میں غزل مقبول صنفِ سخن ہے۔ فارسی اسلوب وروایت کے اس اثر کا اندازہ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات سے بھی کیا جاسکتا ہے جہاں اردو زبان اوزان وبحور، جذبات وتخیّل اور تشبیہ ومحاورہ میں فارسی زبان کی تابع بنادی گئی ہے اور ہندوی جذبات وتخیّلات واوزان ترک کردیے گئے ہیں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ فارسی اسلوب، اصناف وبحور کا باقاعدہ اور پہلا اثر گولکنڈا ہی سے بیجاپور اُس وقت پہنچتا ہے جب مقیمی، غواصی کے تتبع میں اپنی مثنوی "چندربدن ومہیار" لکھتا ہے: "تتبع غواصی کا باندیا ہوں میں"[۱۳]۔

نئے الفاظ وتراکیب: دکنی شعرا کا دَور ایک نئی زبان کے طلوع کا دور تھا۔ غواّصی نے ایسے نئے الفاظ اور تراکیب استعمال کیے جو بعد میں مستعمل نہیں رہے، لیکن اُن کی معنویت نے اُن کے چلن کا امکان آج بھی باقی رکھا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اُو دانا و عاقل جواں مرد تھا مسلماں خدا ترس بادرد تھا

---

[۱۲] ماخذ سابق، ص ۱۰۔۱۱۔

[۱۳] جمیل جالبی، تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل)، ص ۳۸۵۔

بادَرد: دَرد مند

اُلنگتے اُلنگتے چلے تا یمن خبر کئے یمن کے شہنشاہ کن

اُلنگنا: لانگھنا۔ اس کی لغوی تفصیل ہے؛ اَلگنا: پھاندنا۔ اَلگنا: لانگھنا، اُلانگنا۔ اَلنگنا: چھلانگ کر عبور کرنا۔ اِسی سے اُلنگ: چھلانگ ہے، اور اُلنگنی: کمرے میں لگایا ہوا بانس جس پر کپڑے ڈالتے ہیں (دکھنی لغات) بارہ بنکی اور خطہ اودھ میں اسے اَلگنی کہا جاتا ہے[۱۴]۔

دَیا کر جو مجکوں کیا یاد توں سو روں روں کوں میرے کیا شاد توں

رُوں رُوں: رُواں رُواں

صبا اُٹھ بلا دُور دے بے شمار ہتی ہور گھوڑے ہزاراں ہزار

بلادُور: صدقہ

سو آئے دریغے ادکہہ داٹ کر ہوا سخت بے سد سینا پھاٹ کر

داٹ: مضبوط، شدید، پار کرنا (کنڑ)۔ دَاٹنا: رعب ڈالنا، پکڑنا، گھیرنا۔ (دکھنی لغات) اب اس لفظ کو "ڈٹ" کی شکل میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً ڈٹ کر مقابلہ کرنا، یا (کوئی چیز) ڈٹ کر کھانا وغیرہ

سلح پوش سارے بڑے دہات کے بڑت تھوبڑے ہور بڑے ذات کے

ذات: نسل، ڈیل ڈول۔ اب یہ لفظ ڈیل ڈول کے لیے نہیں بلکہ نسل اور نسلی خصوصیات کے لیے بولا جاتا ہے، مثلاً بد ذات، کمینہ ذات۔

بڑے دبدبے سات لیایا اُسے سو پھُل نیر سوں مکھ دھولایا اُسے

پھُل نیر: لغت میں اس کے معنی گلاب دیے ہوئے ہیں۔

محاوروں کی چند مثالیں یہ ہیں:

بندا اُس کے گھر کا سو اقبال تھا بسا سَو اُسے کوٹھریاں مال تھا

اقبال و ترقی کا (کسی کے گھر میں) غلام ہونا۔ بات کرتے ہیں تو عموماً کسی کے اقبال مندی کا ستارا عروج پر ہوتا ہے یا کسی کے اقبال کا سورج بلند ہوتا ہے لیکن غواصی نے اقبال و ترقی کو دست بستہ دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے۔

---

[۱۴] سید ابو تراب خطائی ضامن و محمد صبغتہ اللہ، دکھنی لغات، مالک پبلی کیشنز، بنگلور، ۲۰۰۰ء۔

کہ دہرتا ہوں سینے میں لک خار خار پڑے ہیں کلیجے میں روزن ہزار

کلیجے میں روزن ہونا: کلیجے میں چھید ہونا:

ہنسی سات گلریز جیوں باغ تھی کلیجاں پہ حوراں کے جیوں داغ تھی

کلیجے پر داغ ہونا:

دیکھیاں جیوں بھتیجی کوں آپیں چچا سو پتلی کر انکھیاں کی لیتا اُچا

کیتک اس منے پھول کیتے کلیاں دیکھیں تو نَین کوں اٹھیں گُدگُلیاں

آنکھوں میں گُدگُدی ہونا: مارے خوشی کے آنکھوں کا بار بار کھلنا بند ہونا:

غضبناک ہو جیوں اَنگے دَل ہوئے کلیجے پہاڑاں کے پھٹ جَل ہوئے

کلیجہ پھٹ کے پانی ہونا۔

ایک جزیرے پر جب آتشی لڑکی اس سے صحبت کی بات کرتی ہے تو شہزادہ کہتا ہے کہ جس عورت کے لیے خوار ہو رہا ہوں، جب تک وہ نہیں ملتی کسی اور سے اختلاط کی بات بھی نہیں سوچ سکتا، اِس لیے تو کوئی خیال اپنے دل میں نہ پکا:

بغیر وُو ملے کِس سے نا ہووَں جفت نکو دل میں ہانڈی پکا نار مفت

مثنوی میں لٹ پٹانا، آنکھوں کی پتلی کرنا، دل ہاتھوں میں لینا، تھرتھری چھوٹنا' بے سُدھ ہونا'، 'اُمیدوں کا غنچہ کھلنا'، 'فاختے اُڑنا'، 'درہم برہم ہونا'، 'بخت کے کِواڑ کھلنا'، 'آوازہ عرش تک پہنچنا' جیسے دیگر محاورے بھی آئے ہیں۔

ایک اور خوبی تکرار الفاظ کی ہے جیسے:

نول عاصم اُس راج کا نیک نانوں شہاں میں اتھا اُس شرف ٹھاوں ٹھاوں

ٹھاوں ٹھاوں: جگہ جگہ

بٹے باٹ دَھگ نورتن کے بچھائے مرصع کے خوش بارگاہاں اُچائے

بٹے باٹ: جگہ جگہ۔ باٹ بمعنی راستہ۔ اُردو میں 'باٹ دیکھنا' محاورہ ہے، جس کے مرادی معنی ہیں انتظار کرنا:

پریشان اس کا ہوں ملکے ملوک بھریا ہے رگے رگ منیں اس کا دوک

ملکے ملوک: ملک در ملک۔ رگے رگ: رگ رگ میں، نس نس میں:

کہ پھرتا ہوں نِت یاں دوکانے دوکان		نہ پیونے کوں پانی نہ کھانے کوں کہان

دوکانے دوکان: دُکان تادُکان

مبالغہ: مبالغہ اور تشبیہات جیسے لوازم شعر سے غواصی کیوں غافل رہتے۔ بطورِ مثال:

جتا کچ ہے نازل دوکھہ آفاق پر		جمیا ہے دو دوکھہ میرے سینے بھیتر

یعنی کُل کائنات کا دکھ ایک طرف اور اکیلے میرا دکھ ایک طرف۔

جنگ میں ساتوں آسمان درہم برہم ہوئے جارہے ہیں:

جو دوراج دودھرتے برہم ہوئے		گگن ساتو ہیبت تے درہم ہوئے

تشبیہات: دکنی ادب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنعت وہنرمندی کے باب میں دکنی شعرانے تشبیہ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ غواصی ملک الشعرا تھا جس کا پالا مُلّا وجہی جیسے استاد شاعر سے پڑا تھا۔ یہ بعید تھا کہ وہ تشبیہ سے کام نہ لیتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے بہتر سے بہتر تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔

○ بے اَولادی کے لیے "سَرو" کی تشبیہ ہے:

اَدِک چھاؤں کا روکھہ تھا شہریار		ولے سروِ آزاد جیوں تاجدار

○ خوبصورتی اور نازک بدنی کے لیے ڈھلے ہوئے صاف موتی کی تشبیہ:

ہریک صاف تن ڈھال موتی دیسے		نوے رنگ جالی میں جوتی دیسے

○ پیڑ پودوں پر مستی چھائی ہوئی، صبح کے وقت پتّوں پر شبنم کی بوندیں ایسی جیسے خوبرویوں کے ہاتھ میں موتی:

اتھے بُند شبنم کے یوں پات میں		رتن خاص خوباں کے جیوں ہات میں

○ پپوٹوں کے لیے کواڑ کی ترکیب:

نکو کھول فتنے کے موندے کواڑ		نکو توں ستم منج کوں بہار کاڑ

○ زلفوں کے پیچ گالوں پر جیسے خزانے پر کنڈلی مارے ناگ:

سو پر پیچ زلفاں کوں دیک گال پر		کنڈل گھال بیٹھا بھجنگ مال پر

○ قدموں کو چھوتے کالے لمبے بال جیسے ناگ کی لڑائی:

پڑے بال کالے سوجاں تاں تلے		سو جیوں ناگ لڑتے ہیں پاواں تلے

منظر کشی: اس خوبی کے متعلق محمد علی اثرؔ کا خیال ہے کہ:

غواصی دبستانِ گولکنڈہ کا شاید پہلا شاعر ہے جس نے منظر نگاری کی جانب باقاعدہ توجہ کی ہے۔ غواصی کی منظر نگاری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے بیانات کی بنیاد مشاہدہ پر رکھی ہے۔وہ ایک مصور کی طرح قدرتی مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے[۱۵]۔

مثال ملاحظہ ہو:

○ شہزادی کے چہرے کے تیج کا منظر، صورت حور سے بہتر، تجلی سورج سے بڑھ کر:

نہ اُس سار صورت منے حور کیں　　نہ ویسی تجلّی ستی سور کیں

○ شہ پال اور بادشاہ دریائے قلزم کی لڑائی میں سر کٹی لاشوں کا منظر دیکھیے:

جو دریا لہو ہو اُبلنے لگیا　　گگن اُسپو کشتی ہو چلنے لگیا
سَراں تیرتے لہو کے سمدور تے　　جو دستے اتھے بُڑبُڑے دور تے
دَھڑاں سب نپٹ موج کے لوٹ مار　　تھے ڈبتے نکلتے نہنگاں کے سار

سراپا نگاری: غواصیؔ نے متعدد مواقع پر سراپا نگاری میں بھی اپنی مہارت ثابت کی۔ ایک جگہ زنگیوں کے سردار کی ہیئت کذائی کو اس طرح بیان کیا ہے:

گیا ہونٹ اُپر کا جو یکدھیر کوں　　لگیا تھا پیشانی اوانگ سیر کوں
تلیں کا یوں آیا اتھا لڑک ہونٹ　　جو تھا اس کے گورگیاں منے فرق بہوت
لنبا قد لنبی ناک چوڑے مُلاخ　　دیسے غار کے ناد لبدان فراخ
بڑے ڈانگرے سار کے کان دو　　اجڑ گھر کیرے کھوڑ جو ران دو
مَسے کالے اُس کے اتھے منہ اوپر　　مکھیاں بھنبھناتی ہیں جیوں گوہ اوپر

اسی طرح ایک جشن کی تصویر کشی اس طرح ہے:

کہ زشتاں منے سخت وو زشت تھی　　نپٹ روسیاہی میں انگشت تھی
کہ تھا تھوبڑا اُس کا جیوں فیل کا　　سر اُس کا سو کالا رنجن نیل کا
انکھیاں ڈونگیاں جیوں کھڈی سار کے　　دو دیدہ بہیتر جوں پتھر گار کے
لڑکتی جو چتڑاں پہ چوٹی دِسے　　سو جیوں جھاڑ کی پیڑ موٹی دِسے

---

[۱۵] محمد علی اثرؔ، غواصیؔ: شخصیت اور فن، اِکسل فائن آرٹ، حیدرآباد، ص ۹۰۔

سوئے سار پنڈلیاں اوپر تیز بال نہ تھی جگ میں ڈائن کوئی اُس مثال

بدیع الجمال محوِ خواب ہے۔ اس کے حسن کا نقشہ یوں کھینچا:

عجب نور کیرا اتھا مکھ پہ تاب کہ قربان اُس مکھ پہ لک آفتاب

بھریا نور اوس کا اتھا پور یوں او بلتے تھے اسماں کے سمدور جیوں

ستارے دیکھ اُس کا نچھل نور سب لئے ہات شرمندہ ہو چُور سب

کلیاں سب چمن کے دیکھ اس بھان کوں کیاں چاک اپنے گریبان کوں

جتے سرو واں کے ڈلنہار تھے فدا اُس کے قد پر وو سارے اتھے

اسی طرح جذبات نگاری میں بھی وہ درجہ کمال پر فائز ہے:

○ محبوب کے دیدار کی لذت ایسی کہ دل و دماغ کے ساتھ ذوق و زبان بھی اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں:

انگے ہو کیا شاہزادہ سلام مکھ اس کا دیکھت ذوق پایا تمام

نظریات کا بیان: غواصی نے عوام میں رائج روایتی نظریات سے بھی کام لیا ہے۔ یہ خیال کہ دنیا کسی گائے کے سینگوں پر قائم ہے، اس کو ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے:

سو دریائے قلزم کوں ہیبت چھوٹی زمیں کے تلے گائے اڑرا اٹھی

○ اسی طرح عوامی تصورات اوہام و خیالات اور تہذیبی روایات بھی غواصی نے بڑی خوبی سے شعری بیانیے میں اپنائے ہیں جیسے:

صبا اُٹھ کرے خیر خیرات بھوت کہ ہو تا کہ فرزند اپسے تُرت

خدا کے ولی خوب اچھے کوئی جہاں ننگے پاؤں سوں جائے چلتا وہاں

منگے جاکے پہلے یہی مدعا کرے خدمت ہور اون کی لیوے دعا

○ شرم و حیا کا اعلیٰ سماجی تصور بھی نظر آتا ہے: بدیع الجمال آدم زاد (سیف الملوک) کی مہک پاکر اٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ پری ہے، آتشی مخلوق، تاہم اسی کے ساتھ وہ عورت بھی ہے، اچانک سیف الملوک کو سامنے دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوتی ہے:

گھونگٹ میں چھپا مکھ وہیں ناز سوں ہلوں کھول ادہر نرم آواز سوں

کہی یوں تو واجب نہیں ہیتجے جو نزدیک آکر نچھاوے مجے
میں عورت شرم کی ہوں ہور مرد توں نہ میں تجکوں جانوں نہ توں منجکوں

○ محبت میں شک اور حاسدر شتے داروں کا خوف، محبت کے رازداروں سے تجاہل اور سب سے بڑھ کر دل کے معاملات میں حد کا خیال یہ سب جس مہارت سے اپنی شاعری میں غواصی پیش کرتا ہے، وہ اس کے فن کا عجب کمال ہے۔ چند اشعار بھی پیش کیے جائیں تو یہ مضمون طوالت کے عیب سے داغدار ہو سکتا ہے۔ اس لیے مثنوی کے براہ راست مطالعہ کی لذت اٹھانے کی فرمائش کی جاسکتی ہے۔ دل کے ان معاملات کا بیان کبھی صرف آزمانے کے لیے ہوتا ہے۔ بدیع الجمال خود اپنے دل میں محبت دبائے ہوئے تھی لیکن باتیں شک اور خوف کی کررہی تھی۔ اُس کی ناامیدی بھری باتیں سن کر جب سیف الملوک کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور حالت خراب ہونے لگی تو بدیع الجمال کو یقین ہو گیا کہ وہ اس کا سچا عاشق ہے۔ اُردو داستان کی یہ پہلی عورت ہے جو عاشق کے آنسوؤں کو اپنے آنچل سے پوچھتی ہے اور تسلی دیتی ہے:

پچھانی کہ یو کچ تو بازی نہیں حقیقی پرت ہے مجازی نہیں
اوچائی نزک جا اُسے ہات سوں گلے لاگتی جیو کے سورات سوں
دیتی لک وضا سات جیو دان اُسے سو تحقیق کر پائی ایمان اُسے
محبت جو جاگہ کیا دل منے رکھی پاؤں یاری کے منزل منے
پلُو سات اَنجو اُس کے پونچن لگی بھروسا دے دھیرک سوں بولن لگی
کہ اے میرے من کے سنگاتی اتال نہ کر دوک توں ہور نکو ہو نڈہال

○ واقف کاروں کے سامنے تجاہل برتنا اور رازِ عشق کا خیال رکھنا: بدیع الجمال، سیف الملوک سے بات کر چکی ہے اور اب رخصت ہوا چاہتی ہے تا کہ سراندیل کی شہزادی اور اس کی ماں کے پاس جائے۔ جانے سے پہلے سیف الملوک سے اپنی محبت کے بارے میں رازداری برتنے کو کہتی ہے تا کہ لوگوں کے سامنے اُس کی بات خراب نہ ہو:

تیرے تئیں وو شہزادی ہور اُسکی مائی بہت کچ سفارش کیاں مجکوں آئی
کیتے وضع سوں کر سفارش تیرا پڑی تھی گلے انت لینے میرا

ولے کوچ خاطر میں نالائی میں تغافل میں سوں کر اپس بھائی میں
ابھی توں نکو بول کچ اُن کے دہیر خجل کر نکو گال میرا سریر

○ **محبت میں بھی حد کا خیال رکھنا:** یہ تہذیب کا تقاضا تھا کہ جذبات کے بہاؤ اور تنہائی کی حالت میں بھی سیف الملوک اور بدیع الجمال ناموس کا لحاظ رکھتے ہیں اور ایک حد سے آگے نہیں بڑھتے:

اثر بھید من میں ہوئے مست خیال وو سیف الملوک ہور بدیع الجمال
جو دیکھن لگے خوب ایکس کوں ایک انکھیاں میں رہے کھوب ایکس کوں ایک
ہلوں ہلت میں ہات لینے لگے چُھے لگ محبت سوں دینے لگے
مدن دوطرف تھے جو آیا اوبل ہوئے محو آپس میں آپیں پگل
ہوے سُد گنوا بے خبر دوجنے سُتے مل کے ویں یک بچھانے منے
ولیکن اُنن میں نہ تھا کچ خیال کہ تھے پاک دامن میں دونوں کمال

شادی کے بعد سیف الملوک اور بدیع الجمال حجلۂ عروسی میں ہیں۔ نواب مرزا شوق ہوتے تو جانے کیا گلکاریاں کرتے اور بیان کے کون کون سے در وَا کرتے۔ غواصی نے اس پورے منظر پر کل سات شعر کہے ہیں۔ بدیع الجمال یہاں بھی شرم سے کٹی جارہی ہے:

دیکھیا موکھ جیوں شو نے آروس کا کھلیا سرتے جیوں پھول فردوس کا
چڑی خوب محبوب دیکھ ہات میں ریجھانے لگیا بات کر بات میں
سٹیا ہات جیوں اسپہ طنّاز سوں لگی شرم کر لاجنے ناز سوں
سو چھاتی کوں چھاتی لگا حال سات ہوا لٹ پٹ اُس نور کی ڈال سات
رلیاں میں نپٹ چھند سوں لائیا جُوبن قبّہ نور دو پائیا
جھٹاپٹ لگی ہوونے دوی میں ڈوبے سیس تے پگ تلک خوئی میں
اَدہر مد پلا کر کیا مست اُسے ہوئی مست دیک ویں کیا دست اُسے

مغل خواتین اور فنون لطیفہ

طوبیٰ ادریس، ایم اے، بی ایڈ
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
Tubaidrees687@gmail.com

مغلیہ سلطنت(۱۵۲۶-۱۸۵۷ء) برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا دور تھا جس میں فن و ثقافت نے نئی جہتیں اختیار کیں۔ اس عہد میں مصوری، موسیقی، خطاطی، معماری، باغبانی، اور دستکاری وغیرہ کو بے حد فروغ ملا۔ عام طور پر تاریخی بیانیے میں مرد حکمرانوں اور درباری فنکاروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغل خواتین نے بھی فنونِ لطیفہ کے ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مغل خواتین، خصوصاً شہزادیاں، ملکائیں، اور اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین، فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں مہارت رکھتی تھیں۔ انہوں نے مصوری اور موسیقی سے لے کر باغبانی اور فنِ تعمیر تک، ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ بعض خواتین خود ماہر مصورہ، موسیقار، شاعرہ اور معمار تھیں، جبکہ دیگر نے ان فنون کو فروغ دینے کے لیے ہنر مندوں کی سرپرستی کی۔ ان کے قائم کردہ فنون اور طرزِ زندگی کی جھلک آج بھی مغلیہ دور کی عمارتوں، باغات، دستکاری کے نمونوں، اور مصوری کے شاہکاروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دہلی کی، جو مغلیہ سلطنت کا دارالحکومت تھا، کی مغل خواتین نے فنونِ لطیفہ کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انہوں نے نہ صرف شاہی دربار میں فنون کی سرپرستی کی بلکہ عوامی سطح پر بھی ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ مثال کے طور پر نور جہاں نے فنِ تعمیر اور دستکاری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جہاں آرا بیگم نے باغبانی اور سرائے سازی کو فروغ دیا اور زیب النساء نے موسیقی، شاعری اور مصوری میں دلچسپی لے کر فنکاروں کی سرپرستی کی۔

فن مصوری: سلاطینِ ہند کے دور میں اشرافیہ خواتین کی فنی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات موجود نہیں، البتہ مغل دور میں شاہی خواتین کے فنونِ لطیفہ سے گہرے تعلق کا ذکر

مؤرخین نے کیا ہے۔ مغل خواتین کے لیے مصوری ایک مقبول اور پسندیدہ مشغلہ تھا، خصوصاً حرم کی خواتین اس فن میں دل چسپی رکھتی تھیں ۔ ابوالفضل نے اکبر کے دور کے ۱۰۰ مشہور مصوروں کی فہرست مرتب کی مگر اس میں کسی خاتون مصورہ کا نام شامل نہیں کیا۔ اس کے باوجود، مغل مصوری میں ایسی بے شمار تصاویر موجود ہیں جو حرم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی باریکی سے پیش کرتی ہیں۔ چونکہ حرم کی خواتین عام نظروں سے اوجھل رہتی تھیں، اس لیے ماہرین کا ماننا ہے کہ ان میں سے کچھ تصاویر یقیناً خود خواتین مصوروں نے ہی بنائی ہوں گی۔

مغل دور کی مصوری میں ایسے شواہد بھی موجود ہیں جو شاہی خواتین کی مصوری میں مہارت کو ثابت کرتے ہیں۔ ایک مشہور مغل منی ایچر پینٹنگ میں ایک خاتون کو اپنی تصویر بناتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جبکہ اس کی ایک خادمہ آئینہ تھامے ہوئے بیٹھی ہے تاکہ وہ اپنا عکس دیکھ کر تصویر مکمل کر سکے (۱)۔ مزید برآں، ایک اہم تاریخی دریافت "دی ہیٹیج بی کویسٹ" وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ یہ ایک مغل دور کی نایاب مصوری ہے جس پر ایک خاتون مصورہ صحیفہ بانو کے دستخط موجود ہیں۔ یہ دریافت اس بات کی دلیل ہے کہ مغل دور میں خواتین مصور بھی موجود تھیں، اور وہ نہایت اعلیٰ درجے کی مصوری میں مہارت رکھتی تھیں (۲)۔

ملکہ نور جہاں مصوری سے گہری دل چسپی رکھتی تھیں اور وہ اس فن میں مہارت رکھتی تھیں۔ ان کے شوہر جہانگیر کو بھی مصوری کا بے حد شوق تھا، اور دونوں میاں بیوی اس فن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک مشہور مغل پینٹنگ میں دکھایا گیا ہے کہ حسن غلام نامی مصور دربار میں نور جہاں کے سامنے ایک تصویر پیش کر رہا ہے، اور وہ نہایت غور سے اس کا معائنہ کر رہی ہیں (۳)۔ کہا جاتا ہے کہ نور جہاں خود بھی ماہر مصورہ تھیں اور انہوں نے کئی خوبصورت فن پارے تخلیق کیے (۴)، مگر بدقسمتی سے ان کی مصوری کے اصل نمونے آج دستیاب نہیں ہیں۔

---

(۱)Ahsan Jan Qaisar, *The Indian Response to European Technology & Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 1982, p.1.7a.

(۲) Enakshi Bhavnani, *Creative & Fine Arts In Women Of India*, Ed. Tara Ali Baig, Ministry of Information & Broadcasting, New Delhi, 1957, p. 166.

(۳) Rekha Mishra, *Women In Mughal India 1526-1748 AD*, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi,1967, p. 92, Note 5

(۴) K S Lal, *The Mughal Harem*, Aditya Prakashan, New Delhi, 1988, p. 77

فن موسیقی : مغلیہ دربار میں جہاں مرد موسیقاروں کو عزت و احترام حاصل تھا، وہیں شاہی خاندان کی خواتین بھی موسیقی سے گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ متعدد مغل مصوری کے نمونے اس عہد میں خواتین کی رقص و موسیقی کی محفلوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان تصاویر میں خواتین کو مختلف ساز بجاتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جیسے کہ ڈھول، دف، ستار اور تمبورین، جو اس زمانے میں موسیقی کی مقبولیت کا مظہر ہیں۔ نور جہاں، زیب النساء، جہاں آرا بیگم، اور دیگر مغل خواتین نے موسیقی کو سیکھا، سکھایا، اور کئی موسیقاروں کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس فن کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور کی تاریخ میں کئی خواتین کا ذکر ملتا ہے جو موسیقی اور گانے بجانے کے فن سے واقف تھیں۔ مثلاً، ۱۵۴۹ء کی ایک چاندنی رات میں سارو سہی اور شاہم آغا نامی دو خواتین نے ہمایوں کی شاہی خواتین کو لغمان کے راستے میں اپنی دلنشین آواز میں آہستہ آہستہ گیت گا کر محظوظ کیا[۵]۔ اسی طرح نور جہاں نے اپنی شادی سے قبل کئی بار شاہی خواتین اور شہزادیوں کے لیے گایا اور رقص کیا، جس سے وہ بے حد مسرور ہوئیں۔ ممتاز محل کی آواز نہایت شیریں تھی، اور وہ اکثر اپنے شوہر شاہ جہاں، کی مدح میں نغمے گاتی تھیں۔ انہیں موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ زیب النساء نہ صرف ایک ماہر گلوکارہ تھیں بلکہ موسیقی میں کمال درجے کی مہارت رکھتی تھیں۔ انہوں نے فارسی، عربی اور اردو میں نغمے تخلیق کیے[۶]۔ زین آبادی (حرابائی)، جو اورنگزیب کی زوجہ تھیں، اپنے وقت کی نہایت باصلاحیت گلوکارہ شمار کی جاتی تھیں۔ حرابائی کو شاہ جہاں کے عہد کی مشہور موسیقاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سارس بائی بھی، جو شہزادہ مراد کی محبوبہ تھی، ایک نامور گلوکارہ کے طور پر مشہور تھی۔ نور بائی نے، جو اورنگزیب کے دور کی ایک معروف گلوکارہ تھی، عمر خیام کی رباعیات نہایت سریلی اور مدھر آواز میں گائی[۷]۔ اکبر کے درباری گلوکار، نائک بکشی، کی بیٹی بھی موسیقی میں مہارت رکھتی تھی۔ مشہور موسیقار میاں تان سین نے بھی دکن میں وقت گزار کر اس عظیم گلوکارہ سے موسیقی کی تربیت حاصل کی تھی[۸]۔

---

(۵) Gulbadan., *Humayun Nama*, Trans. by A. Beveridge, Sang–e-Meel Publications, Lahore, 2002, p. 189

(۶) Rekha Mishra, *Women In Mughal India 1526-1748 AD*, p. 95

(۷) Aslam, Prof. M., *Cultural Contribution of Royal Mughal Ladies* (1526-1707 A.D.) Journal of the Punjab University, Historical Society, Vol. 24, 1992, p. 153

(۸) Ibid, p. 92

ملکہ نور جہاں نہ صرف مغلیہ سلطنت کی ایک بااثر شخصیت تھیں بلکہ وہ خود ایک ماہر موسیقار بھی تھیں۔ انہوں نے موسیقی کی تربیت حاصل کی اور کئی نامور موسیقاروں کو اپنی سرپرستی میں رکھا۔ نور جہاں کی گائیکی کے متعلق کئی تاریخی روایات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بہترین گلوکارہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ نور جہاں کی آواز انتہائی سریلی تھی اور وہ خاص طور پر دھرپد اور خیال گانے میں مہارت رکھتی تھیں۔ انہوں نے کئی موسیقاروں کو اپنے دربار میں جگہ دی اور موسیقی کی مختلف اصناف کو فروغ دیا۔ ان کے دور میں کئی نئی دھنیں اور راگ متعارف ہوئے، جنہیں بعد میں بھی گایا جاتا رہا۔ خاص طور پر اس دور میں موسیقی کے دھرپد اور خیال انداز کو خوب فروغ ملا(۹)۔ اس دور میں کئی خواتین گلوکاراؤں نے شہرت حاصل کی جس میں تن رس خانم سب سے مشہور تھی۔

زیب النساء، جو اورنگزیب کی بیٹی تھیں، اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی غیر معمولی مہارت رکھتی تھیں۔ اگرچہ ان کے والد اورنگزیب نے موسیقی کو ناپسند کرتے تھے، لیکن زیب النساء نے خفیہ طور پر موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور کئی موسیقاروں کی سرپرستی کی۔ زیب النساء نے کئی مشہور راگ اور دھنوں کو یاد رکھا اور خود بھی دھنیں تخلیق کیں۔ اس کے علاوہ زیب النساء نے موسیقی میں فارسی اور ہندوستانی روایات کو یکجا کرنے میں مدد دی(۱۰)۔ انہوں نے خواتین گلوکاراؤں اور موسیقاروں کو دربار میں اہم مقام دلانے میں کردار ادا بھی کیا۔ ان کے زیرِ سرپرستی کئی نامور گلوکارائیں پروان چڑھیں، جنہوں نے بعد میں موسیقی میں اپنا مقام بنایا۔ ان میں بی بی کمالا کا نام بہت اہم ہے جو زیب النساء کے دربار میں موسیقی سکھاتی تھی۔

جہاں آرا بیگم، جو شاہ جہاں کی بیٹی تھیں، موسیقی میں غیر معمولی دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کے دربار میں کئی مشہور موسیقار موجود تھے اور کہا جاتا ہے کہ وہ خود بھی کئی راگ گانے میں مہارت رکھتی تھیں۔ جہاں آرا بیگم نے درباری موسیقی کو ترقی دی اور کئی نئی دھنوں کو متعارف کروانے میں مدد کی۔ انہوں نے خواتین موسیقاروں کے لیے خصوصی دربار منعقد کروائے جہاں گانے بجانے کا اہتمام کیا جاتا

---

(۹) Soma Mukherjee, *Royal Mughal Ladies & Their Contributions*, Gyan Publishing House, New Delhi, 2001, p. 222

(۱۰) Rekha Mishra, *Women In Mughal India 1526-1748 AD*, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi,1967, p. 95

تھا۔ جہاں آرا بیگم کی درباری گلوکارہ جس نے خوب شہرت حاصل کی وہ ملکہ جان تھی۔

فن آرائش و زیبائش: مغل خواتین اپنی حسن پرستی، آرائش و زیبائش اور فنی مہارت میں سلطنتِ دہلی کی خواتین سے کہیں آگے تھیں۔ ان کی ذوقِ سلیقہ مندی اور فنی مہارت نے مغلیہ دربار اور محلات کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیے۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواتین نہ صرف اپنے لباس اور زیورات کی آرائش میں دلچسپی رکھتی تھیں بلکہ محلوں، باغات اور شاہی تقریبات کی تزئین و آرائش میں بھی پیش پیش رہتی تھیں۔

جب شہنشاہ ہمایوں نے چنار کی فتح کے بعد کامیابی کے ساتھ آگرہ واپسی کی، تو ماہم بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ اس مسرت کے موقع پر انہوں نے شاندار جشن کا اہتمام کیا اور ذاتی نگرانی میں محلات اور بازاروں کو منفرد انداز میں سجایا۔ یہ آرائش صرف عام سجاوٹ تک محدود نہ تھی بلکہ ان کے تخلیقی ذوق کی عکاسی کرتی تھی، جس میں رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں اور ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا[۱۱]۔

مغل دور میں شاہی تقریبات کو انتہائی شان و شوکت سے منانے کا رواج تھا، جس میں بیگا بیگم کا ذکر نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جب اکبر اعظم کی سنتِ ختنہ (Circumcision) ہوئی، تو ان کے باغات کو خصوصی طور پر آراستہ کیا گیا[۱۲]۔ سلاطین، امراء اور دیگر شاہی شخصیات نے بھی اپنے باغات اور محلوں کو سجا کر اس خوشی میں شرکت کی۔ مؤرخین کے مطابق، ان تقریبات میں بیگمات اور شاہی خواتین نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے باغات کو ایک نئے اور حیرت انگیز انداز میں آراستہ کیا، جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔

ملکہ نور جہاں کا ذوقِ جمالیات بے مثال تھا۔ وہ فنِ آرائش میں اس قدر ماہر تھیں کہ اپنے پہلے شوہر شیر افگن کی وفات کے بعد بھی انہوں نے خود کو محلات کی مرمت اور تزئین میں مشغول رکھا[۱۳]۔ وہ کمروں کی دیواروں کو نہایت نفیس مصوری اور قیمتی قالینوں سے مزین کرتیں۔ دروازوں پر خوشبودار پھولوں کے پردے آویزاں کیے جاتے، جنہیں روزانہ تبدیل کیا جاتا تھا تاکہ ماحول تازہ دم

---

(۱۱) Gulbadan., *Humayun Nama*, p. 113

(۱۲) Ibid, p. 179

(۱۳) Dow, Alexander, *The History of Hindostan (Tr.)* vol. 3, Today & Tomorrow's Printers & Publishers, Delhi, reprint 1973, p. 31.

اور معطر رہے۔ نور جہاں کی ایک اہم اختراع فرشِ چاندنی تھی جو کہ چاندی کا ایک نفیس قالین تھا اور اسے پہلے سے بچھے قالین کے اوپر بچھایا جاتا تھا، تاکہ کمرے کی آرائش میں مزید خوبصورتی پیدا ہو۔ مؤرخ خافی خان کے مطابق، نور جہاں نے اپنے کمرے کے مرکزی دروازے کے لیے ایک نہایت شاندار پردہ تیار کروایا، جو بیش قیمت موتیوں، یاقوت اور زمرد سے مزین تھا[(۱۴)]۔ ان سب کے علاوہ نور جہاں اعلیٰ درجے کی کشیدہ کار اور دستکاری میں ماہر تھیں اور ان کی تخلیقات نے مغلیہ دربار میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ نور جہاں نے ملبوسات کے ایسے جدید ڈیزائن متعارف کرائے جنھوں نے پرانے روایتی طرز کو یکسر بدل دیا۔ شادی شدہ جوڑوں کے لیے انھوں نے ایک مخصوص لباس نور محلی تیار کروایا، جو کہ اعلیٰ معیار کا ہونے کے باوجود محض ۲۵۰۸۶ روپے میں دستیاب تھا[(۱۵)]۔ پشواز (روایتی لمبے گاؤن) کی جگہ انھوں نے دودامی کو فروغ دیا، جو کہ انتہائی باریک اور پھول دار ململ کا بنا ہوتا تھا اور جس کا وزن محض دو دام تھا۔ اسی طرح، اوڑھنیاں جو پہلے بھاری اور بھدے کپڑے کی بنی ہوتی تھیں، ان کی جگہ نور جہاں نے پنچتولیہ متعارف کرایا، جو صرف پانچ تولے وزن کی انتہائی باریک اور نفیس سوتی چادر ہوتی تھی اور حجاب کے لیے بہترین سمجھی جاتی تھی۔ نور جہاں نے زیورات میں بھی نئے اور منفرد ڈیزائن متعارف کرائے۔ ان کے تخلیق کردہ سونے کے زیورات میں ایسے نقش و نگار شامل کیے گئے جو پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے[(۱۶)]۔

نور جہاں کی فنکارانہ حس صرف محلوں اور کمروں کی تزئین تک محدود نہ تھی، بلکہ جہانگیر کے زیرِ استعمال جانوروں کو بھی خاص مواقع پر نہایت خوبصورتی سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ شاہی درباریوں کی طرف سے خوان پوش (Tray Covers) نور جہاں کو تحفے میں دیے جاتے، جنھیں وہ مختلف اشیاء کی آرائش کے لیے استعمال کرتیں۔ ایک مرتبہ جہانگیر نے اپنے ہاتھی کے جسم پر انتہائی نفیس اور دیدہ زیب غلاف دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور نور جہاں کی تخلیقی صلاحیتوں کی دل

---

(۱۴) Mohd Hashim Khafi Khan, *Muntakhab al Lubab*, ed. Maulvi Kabir-ud-din Ahmad, Part 1, Bibliothica Indica, Kolkata, 1869, p. 269.

(۱۵) Beni Prasad, *A Few Aspect of Education & literature Under The Great Mughals*, Indian Historical Records Commission, 1923, p. 158.

(۱۶)T N Hendley, *Indian Jwellery*, vol 1, Cultural Publishing House, Delhi, 1984, p. 10.

کھول کر تعریف کی[۱۷]۔

شہزادی زیب النساء کو اپنے محلات کی سجاوٹ میں خاص دل چسپی تھی۔ وہ اپنے کمروں کو مصنوعی پھولوں کے گلدستوں سے آراستہ کرتیں، جو ان کی اعلیٰ ذوق اور فنکارانہ طبیعت کا واضح ثبوت تھے۔

چونکہ شاہی مغل خواتین کی سرگرمیاں زیادہ تر حرم، محل اور باغات تک محدود ہوتی تھیں، اس لیے انہوں نے ان مقامات کی آرائش وزیبائش میں اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ان کی محنت اور فنکاری نے مغلیہ دربار کو عظمت، خوبصورتی اور تہذیب و ثقافت کی جیتی جاگتی مثال بنا دیا۔ ان کا ذوقِ جمالیات، فنِ آرائش، اختراعات اور نئے فیشن اس بات کا ثبوت ہیں کہ مغل خواتین، خاص طور پر نور جہاں، نہ صرف اپنی خوبصورتی اور نفاست کا خیال رکھتی تھیں بلکہ ان کی فنی تخلیقات نے مغلیہ دربار اور ہندوستانی ثقافت پر گہرے نقوش چھوڑے، جو نسلوں تک قائم رہے۔

فنِ تعمیر: مغلیہ سلطنت میں فنِ تعمیر ہمیشہ سے ایک منفرد اور شاندار پہچان کا حامل رہا ہے، جس میں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ خواتین کا کردار بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ خواتین صرف شاہی محلات تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے اپنی ذہانت، سلیقہ مندی اور فنکارانہ ذوق سے ایسے یادگار تعمیراتی نمونے پیش کیے جو آج بھی تاریخ میں زندہ ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے نہ صرف مغل فنِ تعمیر کو جلا بخشی بلکہ خواتین کے سماجی اور ثقافتی اثر ورسوخ کو بھی نمایاں کیا۔

مغلیہ دور میں فنِ تعمیر میں نمایاں خدمات سر انجام دینے والی پہلی خاتون بیگا بیگم (حاجی بیگم) تھیں، جو ہمایوں کی زوجہ تھیں۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے نہایت عمدگی کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے کی تعمیر کروائی، جو آج بھی مغل فنِ تعمیر کی ایک شاندار مثال ہے۔ اس کے علاوہ، انہوں نے عرب سرائے بھی تعمیر کروائی، جو خاص طور پر عرب تاجروں اور مسافروں کی رہائش کے لیے بنائی گئی تھی[۱۸]۔

اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم نے آگرہ، بیانہ سڑک پر ایک شاہی رہائش گاہ تعمیر کروائی، جو اس

---

(۱۷) Mohd Hashim Khafi Khan, *Muntakhab al Lubab*, p. 269.

(۱۸) Banerjee, S. K., *Humayun Badshah*, vol. I, Oxford University Press, London, 1938, p. 317.

دور کے شاہی طرزِ زندگی کی ایک عمدہ مثال تھی۔ اسی طرح، اکبر کی زوجہ سلیمہ سلطان بیگم نے اپنا مقبرہ تعمیر کروایا، جس کے ساتھ ایک خوبصورت باغ بھی تھا۔ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں مغلیہ دور کی ایک غیر معمولی شخصیت تھیں جنہوں نے فنِ تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے مختلف شاندار تعمیرات کی بنیاد رکھی، جن میں سکندرہ کی سرائے، نور محل کی سرائے (جالندھر کے قریب)، اور آگرہ کے قریب ایک اور نور محل سرائے شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے والد اعتماد الدولہ کے لیے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروایا جو مغلیہ فنِ تعمیر کا ایک شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مؤرخ فرگوسن کے مطابق، یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی اور سب سے زیادہ دلکش عمارتوں میں سے ایک ہے[۱۹]۔ کچھ مؤرخین کے مطابق، لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ بھی نور جہاں کی تخلیق ہے، حالانکہ بعض دیگر مورخین اسے شاہ جہاں کی تعمیرات میں شمار کرتے ہیں۔ نور جہاں نے پتھر مسجد کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد بھی تعمیر کروائی[۲۰]، جو دریائے جہلم کے کنارے واقع تھی۔ یہ مغل فنِ تعمیر کی ایک شاندار مثال تھی، جسے چمکدار سرمئی پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا، اور اس میں عظیم سنگی محرابیں اور دلکش گنبد شامل تھے۔

شاہ جہاں کی بیٹی جہان آرا بیگم نے بھی فنِ تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے آگرہ میں ۵۰۰,۰۰۰ روپے کی لاگت سے ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ شاہ جہاں خود اس مسجد کو تعمیر کروانا چاہتے تھے، مگر جہان آرا کی خواہش پر انہوں نے اسے اپنے ذاتی خرچ سے بنانے کی اجازت دی۔ جہان آرا بیگم نے دہلی میں ایک شاندار کارواں سرائے، بیگم سرائے تعمیر کروائی، جس کا موازنہ مشہور مؤرخ برنیئر نے پیرس کے شاہی محلات سے کیا۔ اس سرائے میں خوبصورت باغات، پانی کے تالاب، اور مکمل سیکیورٹی کے انتظامات موجود تھے۔ صرف مغل شاہزادے، وزراء اور امیر تجارتی قافلے یہاں قیام کر سکتے تھے۔ بدقسمتی سے، یہ سرائے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد تباہ

---

(۱۹) James Fergusson, *History of Indian & Eastern Architecture*, vol 2, Rupa Publication India, New Delhi, 2011, pp. 305-306

(۲۰) Shujauddin, Mohammad, *The Life and Times of Noorjahan*, Caravan Book House, 1967, p. 44

کردی گئی، اور اب اس جگہ کوئینز گارڈن قائم ہے[۲۱]۔ جہان آرا نے چاندنی چوک بازار (دہلی) اور چوک سرائے بازار (لاہور) کی منصوبہ بندی اور تعمیر میں بھی اہم کردار ادا کیا، جو آج بھی ان کی ذہانت اور بصیرت کے مظہر ہیں[۲۲]۔

اورنگزیب کی بیٹی زینت النساء بیگم نے ۱۴؍ شاندار سرائیں تعمیر کروائیں۔ برطانوی سفیر نوریس نے اپنی سفری دستاویزات میں ان میں سے ایک کا تذکرہ کیا ہے[۲۳]۔ زینت النساء بیگم نے ۳۷؍ سال کی عمر میں ایک عظیم منصوبہ شروع کیا، جس کے تحت انہوں نے اودھ سے بنگال جانے والی شاہراہ پر کئی سرائیں تعمیر کروائیں، تاکہ مسافروں کو آرام اور سہولت میسر آسکے۔ ان کا سب سے نمایاں تعمیراتی کارنامہ زینت المساجد کی تعمیر تھی، جو دہلی میں ان کے ذاتی خرچ پر بنائی گئی۔ روایت کے مطابق، انہوں نے اپنے والد، اورنگزیب سے اپنے مہر (جہیز) کی رقم کا مطالبہ کیا اور اس پوری رقم کو اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر میں خرچ کر دیا۔ یہ مسجد کواری مسجد یا کنواری مسجد کے نام سے بھی مشہور ہے[۲۴]، جو اس بات کی علامت ہے کہ زینت النساء نے شادی نہیں کی اور اپنی زندگی کو خدمت اور فلاحی منصوبوں کے لیے وقف کر دیا۔ ان کا یہ کارنامہ مغلیہ خواتین کی سماجی و ثقافتی خدمات کی ایک درخشاں مثال ہے، جو آج بھی تاریخ میں زندہ ہے۔ اسی طرح، قدسیہ بیگم نے جو احمد شاہ کی والدہ تھیں، نے جمنا کے کنارے ایک وسیع باغ (قدسیہ باغ) اور ایک شاندار محل تعمیر کروایا، جو اس وقت کی تعمیراتی عظمت کا مظہر تھا[۲۵]۔

مختصر یہ کہ مغلیہ خواتین کے زیرِ نگرانی تعمیر ہونے والی مساجد، مقبرے، سرائیں اور باغات آج بھی ان کے تخلیقی ذوق، ذہانت اور فنی مہارت کے زندہ گواہ ہیں۔ ان کی خدمات نہ صرف فنِ

---

(۲۱) Niccololao Manucci, *Storia Do Mogor or Mogul India*, vol 1 trans. William Irvine, Atlantic Publishers & Distributers, New Delhi, 1978, p. 213

(۲۲) Mukharjee, Dr. Soma, *Royal Mughal Ladies and their contribution*, Gyan Publishing House, Delhi, 2013 (Reprint), pp. 201-203.

(۲۳) Harihar Das, *The Norris Embassy to Aurangzib* 1699-1702, condensed & rearranged by S. C. Sarkar, K L Mukhopadhyay, Kolkata, 1959, p. 236

(۲۴) Sarkar, Jadunath. , *History of Aurangzeb*, vol. I, M.C. Sarkar & Son's, Calcutta, 1912, p. 38

(۲۵) Carr Stephen, *Archeology & Monumental Remains of Delhi*, Asiatic Society of Bengal, 1876, pp. 274-275

تعمیر کی تاریخ میں ایک سنہری باب ہیں بلکہ یہ اس بات کا ثبوت بھی ہیں کہ مغل خواتین نے نہ صرف شاہی دربار میں بلکہ معاشرتی ترقی میں بھی اپنا فعال کردار ادا کیا۔

باغات کی تعمیر: مغل سلطنت کی تاریخ میں جہاں بادشاہوں نے شاندار محلات، مساجد، اور قلعے تعمیر کروائے، وہیں شاہی مغل خواتین نے بھی باغات کی تعمیر میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان باغات کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محض تفریحی مقامات نہیں تھے بلکہ ان میں قدرتی حسن، جھرنے، نہریں، سایہ دار درخت، خوشبودار پھول اور نایاب نباتات کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ ان باغات کی تزئین و آرائش اور رکھ رکھاؤ میں مغل خواتین کی اعلیٰ ذوقی اور نفاست کا عکس جھلکتا ہے۔ یہ باغات صرف مغل خواتین کے ذوقِ جمالیات کی علامت نہیں تھے بلکہ وہ اس عہد کے سماجی و ثقافتی مراکز بھی تھے، جہاں شعر و ادب کی محفلیں منعقد ہوتیں، سیاسی و ادبی گفتگو ہوتی، اور اہلِ علم و دانش جمع ہوتے۔ مغل خواتین کی یہ تعمیرات آج بھی برصغیر کے تاریخی ورثے کا ایک حسین باب ہیں اور ان کی خوبصورتی کا عکس ہماری تہذیب میں آج بھی نمایاں ہے۔

مغل خاندان میں باغات کی تعمیر کا رجحان بابر کے عہد سے ہی شروع ہو چکا تھا، لیکن مغل خواتین نے اسے مزید وسعت دی۔ حاجی بیگم نے جو ہمایوں کی اہلیہ تھیں، نے آگرہ سے بیانہ جانے والے راستے پر ایک خوبصورت شاہی محل اور باغ تعمیر کروایا، جس کا ذکر تھیونوٹ (Thevenot) نے کیا ہے کہ یہ محل اور اس کے باغات بہترین نظم وضبط میں رکھے گئے ہیں[۲۶]۔

جہانگیر نے اپنی یادداشتوں میں ان باغات کا ذکر کیا ہے جو مختلف مغل خواتین نے بنوائے، جیسے کہ بیگا بیگم، جو بابر کی بیوہ تھیں، مریم مکانی (جہانگیر کی دادی) اور شہر بانو بیگم (مرزا ابو سعید کی بیٹی)، جو بابر کی پھوپھی تھیں۔ جہانگیر نے اپنی والدہ مریم زمانی کے جسوت پرگنہ میں تعمیر کردہ ایک باغ اور ایک اور باغ کا ذکر کیا ہے، جو انہوں نے اپنی سوتیلی والدہ رقیہ سلطان بیگم کو تحفے میں دیا تھا[۲۷]۔ آگرہ میں دہرہ باغ اور زہرا باغ بھی موجود ہیں، جنہیں کہا جاتا ہے کہ بابر نے اپنی بیٹی زہرا

(۲۶) M. De Thevenot, *Indian Travels of Thevenot and Careri*, ed, S N Sen, National Archives of India, New Delhi, 1949, p. 57

(۲۷) Jahangir, Nur-ud-din Muhammad., *Tuzuk–I-Jahangiri*, Tr. Roggers & Beveridge, Vol. II, 1925, Lahore, p. 64

کے لیے بنوایا تھا۔ بعض مورخین کا ماننا ہے کہ یہ دراصل ایک ہی باغ تھا، جس کے دو مختلف نام تھے۔ کچھ مؤرخین کے مطابق نور جہاں نے بعد میں اس باغ کو از سر نو تعمیر کروا کر نور منزل کا نام دیا، جو جہانگیر کے سیر و تفریح کا ایک مشہور مقام بن گیا تھا[۲۸]۔

نور جہاں کو تفریحی مقامات اور قدرتی حسن سے بھرپور باغات کی تعمیر میں مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے لاہور کے قریب شاہدرہ میں دل آمیز یا دلکشا باغ تعمیر کروایا، جہاں بعد میں جہانگیر کو دفن کیا گیا[۲۹]۔ ان کے وکیل نے جالندھر میں نور سرائے کے مقام پر ایک شاندار محل اور باغ تعمیر کروایا۔ آگرہ میں ایک اور باغ "موتی باغ" تھا، جس کی تعمیر نور جہاں سے منسوب کی جاتی ہے۔ منڈی اور پیلسارٹ کے مطابق، آگرہ میں موجود نور محل کی سرائے دو باغات کے درمیان واقع تھی، ایک چار باغ اور دوسرا موتی باغ۔ نور جہاں نے نور منزل (باغِ دہرا) اور نور افشاں باغ بھی تعمیر کروائے۔ چونکہ جہانگیر سال کا نصف حصہ کشمیر میں گزارتے تھے، نور جہاں نے وہاں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور بیگم آباد (صاحب آباد) کے نام سے ایک باغ تعمیر کروایا، جس میں بہتے چشمے اور پھلوں سے لدے درخت موجود تھے۔ مشہور سیاح برنئیر نے اس باغ کی خوبصورتی کو یوں بیان کیا:

یہ باغ نہایت خوبصورت ہے، اس میں راستے بڑے منظم انداز میں بنائے گئے ہیں اور ہر طرف پھلدار درخت موجود ہیں۔ اس میں پانی کے فوارے اور حوض بڑی تعداد میں ہیں، جبکہ ایک بلند آبشار بھی ہے، جو بہتے ہوئے ایک وسیع چادر کی مانند نظر آتا ہے، خاص طور پر رات کے وقت جب دیواروں میں مخصوص جگہوں پر رکھے گئے چراغ روشن کیے جاتے ہیں، تو اس کا منظر انتہائی دلکش معلوم ہوتا ہے[۳۰]۔

برنئیر نے کشمیر میں ویرناگ کے ایک اور باغ کا بھی ذکر کیا ہے، جسے نور جہاں نے ڈیزائن کر

---

(۲۸) Sylvia Crowe & Shelia Hayhood, *The Gardens of Mughal India*, Vikas Publishing House Pvt Ltd, Delhi, 1973, p. 63

(۲۹) C M V Stuart, *Gardens of the Great Mughals*, R S Publishing House, Allahabad,1979, pp. 130-131

(۳۰) Francois Bernier, *Travels in the Mogul Empire*, A D 1656-1668, 2nd ed. S Chand & Co, New Delhi, 1968, p. 413

کے تعمیر کروایا تھا۔ اسی طرح، ڈل جھیل کے مغربی کنارے پر باغِ بہار آراء بھی انہی کا تعمیر کردہ تھا، اگرچہ اب اس کے کچھ ہی آثار باقی ہیں۔

ممتاز محل نے دہلی اور آگرہ میں مغل باغات کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی بیٹی جہان آراء بیگم بھی باغات کی شوقین تھیں۔ انہوں نے دہلی قلعے کے باہر بیگم کا باغ تعمیر کروایا، جو اس دور میں ملاقاتوں اور تفریح کے لیے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ، انہوں نے کشمیر میں باغِ عیش آباد، باغِ نورافشاں اور باغِ صفا تعمیر کروائے جو جواہر خان خواجہ سرا کی نگرانی میں مکمل ہوئے[۳۱]۔ انہوں نے امبالہ (کذا)، سورت اور اچھہ بل میں بھی باغات تعمیر کروائے۔ جہان آراء بیگم کو اپنی والدہ کی وفات کے بعد باغِ جہان آراء وراثت میں ملا، جبکہ ان کے والد شاہجہان نے انہیں باغِ شہر آراء بطور تحفہ دیا۔ شاہجہان کی دوسری بیٹی روشن آراء بیگم نے دہلی میں روشن آراء باغ تعمیر کروایا، جہاں ان کا مقبرہ بھی موجود ہے[۳۲]۔ شاہجہان کی اہلیہ اکبر آبادی بیگم (عز النسا) نے لاہور میں کشمیر کے شالیمار باغ کے طرز پر ایک شاندار باغ تعمیر کروایا، جس پر دولاکھ روپے کی لاگت آئی۔ زیب النسا بیگم نے بھی لاہور میں اپنا باغ تعمیر کروایا، جہاں انہیں بعد میں دفن کیا گیا۔ چار بُرج باغ بھی انہی کا تعمیر کردہ تھا، مگر انہوں نے اسے اپنی خادمہ میاں بائی کو تحفے میں دے دیا، جس نے اس باغ کی تعمیر کی نگرانی کی تھی۔ اس تحفے کا ذکر باغ کے دروازے پر کندہ فارسی اشعار میں موجود ہے[۳۳]۔

مختصر یہ کہ مغل خواتین نے فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں بے پناہ خدمات انجام دیں۔ مصوری، موسیقی، رقص، تعمیرات، اور باغات کی تزئین میں ان کا کردار نمایاں رہا۔ انہوں نے فنون کی ترقی میں عملی حصہ لیا اور ان کی سرپرستی میں برصغیر میں ایرانی، ترک، اور ہندوستانی فنون کا حسین امتزاج وجود میں آیا۔ یہ کہنا بجا ہو گا کہ مغل خواتین نے فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں ایک ایسا سنہرا باب رقم کیا جس کی روشنی آج بھی مغلیہ ورثے کی صورت میں نمایاں ہے۔ ان کی تخلیقات، سرپرستی، اور خدمات نہ صرف برصغیر کی ثقافتی تاریخ کا حصہ ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔

---

(۳۱) Kumbuh, Mulla M. *Saleh.* , *Amal–i–Saleh*, Ed. Mumtaz Liaqat, 1988, Lahore, p. 231

(۳۲) C M V Stuart, *Gardens of the Great Mughals*, R S Publishing House, Allahabad,1979, p.108

(۳۳) Ibid, pp. 134-135

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا ساٹھ سالہ سفر

سہیل انجم

sanjumdelhi@gmail.com

آزاد ہندوستان کی ملی تاریخ میں ''آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت'' ایک نمایاں اور روشن مقام رکھتی ہے۔ اس نے اپنے قیام کے بعد سے لے کر آج تک متعدد نشیب و فراز دیکھے اور اسے کئی مرحلوں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ جب ہم اس کے ساٹھ سالہ سفر پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ایسے کئی سنگ ہائے میل دکھائی دیتے ہیں جو ملت کے پر عزم قافلے کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتے ہیں اور بہ زبان حال کہہ رہے ہیں کہ ''ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی''۔ اس راستے میں ملی کامیابیوں کے روشن نقوش بھی ہیں اور ناکامیوں اور اختلافات و انتشار کے تکلیف دہ نشانات بھی۔ تاہم مشاورت نے زخم کھائے ہیں تو ان زخموں کا مداوا بھی کیا ہے۔ ملت جب درد و کرب میں مبتلا ہو کر تڑپنے لگی تو اس نے اس کا علاج بھی تجویز کیا۔ دراصل یہ تنظیم خودرو پودے کی مانند وجود میں نہیں آگئی تھی بلکہ اس کے قیام کے محرکات ہیں اور ان محرکات کے نتیجے میں اساطینِ ملت کے سنجیدہ غور و فکر کے ادوار ہیں۔ یعنی مشاورت کا قیام دور رس اور طویل مدتی حکمت عملی کے تحت عظیم مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہوا تھا۔ تاریخ اس کا فیصلہ کرے گی کہ وہ مقاصد حاصل ہوئے یا نہیں۔ ملت کو بحرانوں سے نکالنے کے لیے جن عزائم کا اظہار کیا گیا تھا وہ پورے ہوئے یا نہیں اور یہ کہ وہ عزائم اب بھی باقی ہیں یا حالات کے تھپیڑوں سے شکست کھا کر اپنی موت آپ مر چکے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی لہو رنگ رہی ہے۔ یہ ہمیں خون کے دریا عبور کرکے اور لاشوں کے انبار سے گزرتے ہوئے ملی ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تقسیم ہند کے وقت تباہی و بربادی کا جو طوفانِ بلاخیز آیا تھا وہ بعد میں تھم گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طوفان نے ہندوستانی مسلمانوں کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ ان کی کشتیِ وجود وقت اور حالات کے دریا میں ہمیشہ ہچکولے کھاتی رہی۔ تقسیم کے زخم ابھی بھرے بھی نہیں تھے کہ فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان فسادات کو

دردمندانِ ملت نے ''مسلم کش فسادات'' کا نام دیا۔ شمالی ہند کی کئی ریاستیں ان کی چپیٹ میں آگئی تھیں۔ مسلمانوں کو خاک وخون میں نہلایا جانے لگا۔ بہت سے مسلمان شکست خوردگی اور مایوسی وناامیدی کے شکار ہو کر ترکِ وطن کرنے پر غور کرنے لگے۔ لیکن جاتے کہاں اور کہاں پناہ ڈھونڈتے۔ مذہب کے نام پر قائم ہونے والے ملک پاکستان کے حالات بھی کوئی بہت اچھے نہیں تھے اور جو مسلمان ہندوستان سے ہجرت کرکے وہاں گئے تھے انھیں باعزت زندگی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ اس صورت حال نے زعمائے ملت کو بے چین ومضطرب کر دیا۔ بالخصوص نہرو کابینہ کے وزیر ڈاکٹر سید محمود نے حالات کی سنگینی کا ادراک کیا اور ایک مسلم کنونشن منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ لہٰذا، ۱۱۔۱۲ جون ۱۹۶۱ کو دہلی میں یہ کنونشن منعقد ہوا۔ سید صباح الدین عبد الرحمن اپنی کتاب ''ڈاکٹر سید محمود'' میں رقم طراز ہیں کہ وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی ناپسندیدگی کے باوجود یہ کنونشن نہ صرف منعقد ہوا بلکہ کامیاب بھی رہا۔

لیکن فسادات کا سلسلہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود اس پہلو پر مسلسل غور وخوض کرتے رہے کہ مسلمانوں کو اس بحران سے کیسے نکالا جائے۔ اسی اثنا میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی نے ان سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے پر زور دیا۔ ان کے اصرار پر انھوں نے تمام مختلف الخیال مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی تجویز پیش کی۔ بالآخر آٹھ اور نو اگست ۱۹۶۴ کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک مشاورتی اجتماع منعقد ہوا جس میں ''آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ڈاکٹر سید محمود کو اس کا بانی صدر منتخب کیا گیا۔ مشاورت کا قیام مسلمانوں کو درپیش مسائل ومصائب اور خاص طور پر مسلم کش فسادات کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں امید ویقین کی ایک روشن کرن تھی۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ مختلف مکاتب فکر کے مسلمان اور مسلم تنظیمیں اور جماعتیں بلاتردد ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ واقعہ آزاد ہندوستان میں ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں جس نئے اور عملی دور کا آغاز کیا گیا اس کے اثرات کافی دنوں تک محسوس کیے جاتے رہے۔ مشاورتی اجتماع میں جو زعماء تشریف لائے ان میں ڈاکٹر سید محمود، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا ابو اللیث اصلاحی، مولانا محمد منظور نعمانی، قاری محمد طیب، مولانا اسعد مدنی، مولانا منت اللہ رحمانی، ملا جان محمد اور ذو الفقار اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پورے ملک میں اس قدم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مشاورت کی جانب سے ملت کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف پروگرام ترتیب دیے گئے۔ شہروں کے دورے کیے گئے۔ اس کی ریاستی اور ضلعی شاخیں قائم کی جانے لگیں۔ مختصر عرصے میں مشاورت کو پورے ملک کے مسلمانوں کا بھرپور اعتماد حاصل ہو گیا۔ مسائل کے حل کے لیے مشترک کوششیں شروع ہوئیں اور ایک متحدہ مسلم قیادت سے ملک بھر کے مسلمانوں کو بڑا سہارا ملا۔ لیکن اس کے فعال اور محنتی سکریٹری جنرل ایم این انور کے کم عمری میں انتقال نے اسے پہلا شدید دھچکہ لگایا۔ لیکن بہر حال مشاورت اپنا کام کرتی رہی۔ لیکن تا بکے؟ انتشار و اختلاف تو ملت کا ''طغرۂ امتیاز'' ہے۔ لہٰذا دو سال کی قلیل مدت کے بعد ہی انتشار و اختلاف نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کا آغاز مشاورت میں شامل ایک بڑی مسلم جماعت ''جمعیۃ علماء ہند'' کی جانب سے اپنے بینر سے ایک ''جمہوری کنونشن'' کے انعقاد کے فیصلے سے ہوا۔ اس فیصلے نے اختلافات کو ہوا دی اور نتیجتاً اس جماعت نے خود کو مشاورت کے پلیٹ فارم سے الگ کر لیا۔

اسی اثنا میں ۱۹۶۷ کے عام انتخابات کا وقت آ گیا۔ بقول سید محمود، یہ معاملہ مشاورت کے لیے پیغام اجل ثابت ہوا۔ انتخابات میں حصہ لینے یا نہ لینے کے معاملے پر اختلافات پیدا ہو گئے۔ حالانکہ مشاورت کے دستور میں سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے کوئی ذکر نہیں تھا۔ البتہ یہ طے شدہ پالیسی تھی کہ مشاورت پارلیمانی سیاست سے الگ رہے گی۔ لیکن بہر حال مسلمانوں کا ایک طبقہ انتخابات میں حصہ لینے کا حامی تھا۔ ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی اور ان کے رفقائے کار حصہ لینے کے حامی تھے۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی نے ڈاکٹر سید محمود کے نام ایک مکتوب میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد انتخابات میں حصہ لینے کے خیال کی تائید کی۔ یہ رائے ظاہر کی گئی کہ مشاورت الیکشن میں حصہ نہیں لے گی لیکن ملت کو اس سے دور رہنے کا مشورہ بھی نہیں دے گی۔ لہٰذا ایک ۹/ نکاتی منشور تیار کیا گیا جس میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ پارٹی کی بنیاد پر نہیں بلکہ امیدوار کی بنیاد پر ووٹ کریں۔ سید صباح الدین عبد الرحمان کہتے ہیں کہ اس منشور میں، بعد میں ڈاکٹر صاحب کی مرضی کے برخلاف ایک پیراگراف جوڑ دیا گیا جو حکومت اور کانگریس سے شکایت اور اس کو دھمکیوں سے پُر تھا جبکہ مشاورت کے منشور میں شکوہ و شکایت سے دور رہنے کی بات کہی گئی تھی۔ اس صورت حال نے ڈاکٹر سید محمود کو دل برداشتہ کر دیا اور وہ مشاورت کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔

ادھر ۱۹۶۸ میں ”مسلم مجلس“ نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دے دی گئی۔ اس قدم نے اختلافات کو مزید ہوا دی۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اس جماعت کے سرخیل ہوئے۔

بعد میں مفتی عتیق الرحمن عثمانی کو مشاورت کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ ۱۹۷۴ سے ۱۹۸۴ تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۸۳ میں دو نائب صدور منتخب کیے گئے، یعنی ذوالفقار اللہ سینئر اور سید شہاب الدین جونئیر نائب صدر۔ اس درمیان مشاورت کے بینر سے ملت کے مسائل اٹھائے جاتے رہے اور حکومتوں کو ان کی طرف متوجہ کیا جاتا رہا۔ ان میں محکمہ آثار قدیمہ کی مساجد میں نماز کی ادائیگی کی تحریک اور مسلم مخالف فسادات میں مسلمانوں کی دادرسی جیسے امور قابل ذکر ہیں۔ اس نے پوٹا، ٹاڈا، پولیس اور سیکورٹی فورسز میں مسلم نمائندگی اور مذہبی مقامات سے متعلق مسائل بھی اٹھائے۔ لیکن جو جوش وخروش اور ولولہ ابتدائی دو برسوں میں نظر آیا تھا وہ بعد میں معدوم ہو گیا۔ لیکن بہر حال کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا۔

مشاورت کی کوششوں سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا جس کا کام مسلمانوں کے عائلی مسائل میں ان کی رہنمائی کرنا اور ان مسائل کو حل کرنا تھا۔ بعد میں اس کا دائرۂ عمل بڑھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ بابری مسجد کی قانونی لڑائی لڑنے کے لیے بابری مسجد ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ دونوں نائب صدور اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے لیکن حقیقتاً اصل کام سید شہاب الدین کر رہے تھے۔ لہٰذا انھیں مشاورت کا کارگزار صدر مقرر کر دیا گیا۔ بعض وجوہ کی بنا پر انھوں نے ۱۹۹۰ میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ بعد میں ذوالفقار اللہ کو صدر مقرر کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں آل انڈیا ملی کونسل کا قیام عمل میں آیا جسے مشاورت میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

مشاورت کی عدم سرگرمی اور جوش وخروش کے فقدان سے زعمائے ملت کافی فکر مند تھے۔ وہ بار بار مشاورت کے تنِ مردہ میں نئی جان پھونکنے کی اپیلیں کرتے رہے۔ اس سلسلے میں متعدد اجلاس کا بھی انعقاد کیا گیا۔ مشاورت کا قافلہ اختلافات کی وجہ سے سست روی کا شکار رہا تاہم کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا۔ لیکن جون ۲۰۰۰ میں مشاورت کے انتخاب کے طریقۂ کار پر کچھ ارکان کو اعتراض ہوا اور انھوں نے ایک متوازی مشاورت بنالی۔ ۲۰۰۱ میں مہندیان میں اس گروپ کا جلسہ ہوا جس میں بہ اتفاق رائے مولانا محمد سالم قاسمی کو صدر اور مولانا احمد علی قاسمی کو جنرل سکریٹری منتخب کر لیا گیا۔ اس طرح ایک گروپ سید شہاب الدین کی صدارت میں اور دوسرا مولانا سالم قاسمی کی

صدارت میں اپنا کام کرتا رہا۔ دوسرے گروپ نے فسادات کی روک تھام، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی اور مقبوضہ جائدادوں کی بازیابی سمیت متعدد مسائل اٹھائے۔ اس نے جگہ جگہ کے دورے بھی کیے اور ضرورت مند مسلمانوں کی امداد کے لیے کام بھی کیا۔ اس نے اخبارات ورسائل میں بیانات کی اشاعت سے بھی خود کو فعال رکھا۔

اس درمیان سید شہاب الدین کی صدارت والی مشاورت نے اس کے لیے ایک مستقل دفتر کی کوششیں شروع کیں۔ چونکہ اس کا کوئی مستقل دفتر نہیں تھا اس لیے ملت کا کام مربوط انداز میں نہیں ہو پارہا تھا۔ یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور ابوالفضل انکلیو میں اس کے لیے ایک عمارت خرید لی گئی۔ سید شہاب الدین آخر وقت تک اسی عمارت سے مشاورت کا کام کرتے رہے۔ انھوں نے "مسلم انڈیا" نامی ایک بلیٹن بھی شروع کیا جو ڈاکومنٹیشن کا بہترین نمونہ تھا۔ ۲۰۰۴ میں انھیں پھر مشاورت کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ تیسری مرتبہ بھی انھیں صدر منتخب کیا گیا۔

اس کے بعد سید شہاب الدین ناسازیِ طبع کی وجہ سے زیادہ فعال نہیں رہ گئے۔ لہٰذا ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے کارگزار صدر کی حیثیت سے اس کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس سے قبل بھی انھیں مشاورت کا صدر منتخب کیا جا چکا تھا۔ وہ دو بار دو، دو سال کی مدت کے صدر منتخب ہوئے۔ یعنی ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ اور ۲۰۱۴۔۲۰۱۵ کی مدت کے لیے۔ ملت کے اندر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کو ان کی لیاقت وصلاحیت اور قومی وملی خدمات کے پیش نظر قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ انھوں نے اپنی مدتِ صدارت میں کافی اہم کارنامے انجام دیے جن میں فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کی باز آبادکاری، حادثات کی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹس کی تیاری، مختلف وزارتوں اور محکموں کے نام خطوط، ملی مسائل کے حل کے لیے حکومتوں پر زور ڈالنے کی غرض سے دھرنے اور احتجاج، وزرا اور وزیر اعظم سے ملاقاتیں اور دہشت گردی کے شکار مسلمانوں کو انصاف دلانے کی کوششوں سمیت متعدد مساعی شامل ہیں۔

مشاورت سے ہمدردی رکھنے والی سرکردہ شخصیات مشاورت کے دو دھڑوں میں منقسم ہو جانے سے خوش نہیں تھیں۔ وہ اس خیال کی حامی تھیں کہ اس تقسیم نے مشاورت کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دیا ہے۔ دونوں مشاورت کے ذمہ داران بھی تقسیم سے رنجیدہ خاطر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دونوں دھڑوں کا انضمام ہو جاتا ہے تو زیادہ مربوط انداز میں کام کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کوششیں بارآور

ہوئیں۔ غور و فکر اور تدبر کے ساتھ دونوں گروپوں کے ذمہ دار آگے بڑھے اور مشاورت کے عہدِ رفتہ کی عظمتوں کی بازیابی کے لیے مولانا سالم گروپ ۲۷ اکتوبر ۲۰۱۳ کو دوسرے گروپ میں ضم ہو گیا۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب کی صدارت میں مشاورت نے نئے جوش و خروش کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ انھوں نے ملک کی تقریباً تمام موقر تنظیموں کے اشتراک سے ریزرویشن، دہشت گردی اور فلسطین میں اسرائیلی ظلم وستم، برما کے روہنگیا مسلمانوں پر مظالم اور مصر میں فوجی انقلاب کے ذریعے جمہوری صدر کی بے دخلی وغیرہ کے خلاف دھرنے دیے۔ جنتر منتر پر دیے جانے والے دھرنوں میں بڑی تعداد میں مسلم وغیر مسلم افراد شرکت کرتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کی بحالی کی کوششیں کی جانے لگیں۔ فسادات سے متاثرہ مقامات کا دورہ کرکے رپورٹیں تیار کی گئیں اور ان کا اجرا عمل میں آیا۔ ۲۰۱۲ میں آسام میں ہونے والے مسلم مخالف فسادات کا جائزہ لینے کے لیے وہ ایک وفد لے کر متاثرہ علاقوں میں گئے۔ ۲۰۱۳ میں مظفر نگر فسادات کے نتیجے میں بے گھر ہو جانے والے مسلمانوں کی بازآبادکاری کے اقدامات کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ سے ایک وفد کے ساتھ ملاقات کی۔ انھوں نے ۳۱ر اگست ۲۰۱۵ کو مشاورت کی گولڈن جوبلی کانفرنس دہلی میں منعقد کی۔ اس کا افتتاح نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے کیا۔ اس میں ملک بھر سے مندوبین نے شرکت کی۔ اس موقع پر ایک خوبصورت اور معلوماتی یادگاری مجلہ بھی شائع کیا گیا۔ قبل ازیں وہ ۲۰۱۰ میں مشاورت کی قیادت میں ایک بین الاقوامی بین المذاہب کانفرنس بھی دلی میں منعقد کر چکے تھے۔ انھوں نے دہشت گردی کی وارداتوں میں بے قصور مسلمانوں کی گرفتاری کے خلاف آواز بلند کی۔ مشاورت کے پلیٹ فارم سے ہر ماہ کسی اہم موضوع پر کسی اہم شخصیت سے لیکچر دلوانے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ غرضیکہ ان کے دور صدارت میں مسلم مجلس مشاورت کافی فعال رہی۔

اس کے بعد ۲۰۱۶ میں نوید حامد کو دو سال کے لیے مشاورت کا صدر منتخب کیا گیا اور ۲۰۱۷ کے آخر میں مزید دو سال کے لئے ان کا بحیثیت صدر انتخاب عمل میں آیا۔ ان کی مدتِ صدارت ۲۰۱۹ میں ختم ہو گئی۔ لیکن وہ ایک متنازع خط کی بنیاد پر اس عہدے پر اگلے چار سال بلا انتخاب قائم رہے۔ انھوں نے مشاورت کے دستور میں ضروری جمہوری کارروائی کے بغیر ترمیم کا فیصلہ کیا جس کے

مطابق صدر کی مدتِ کار دو سال سے بڑھا کر چار سال کر دی گئی اور کچھ ایسی جدت پیدا کی گئی جس سے زبردست تنازع پیدا ہوا۔ اس صورت حال کو غیر جمہوری طور پر ختم کرنے کے لئے نوید حامد نے بڑی تعداد میں مشاورت کے قدیم واصیل ممبران کی رکنیت خارج کر دی۔ پھر نئے دستور کے تحت انتخابات کرائے گئے۔ کچھ تنظیموں اور ممبران نے حصہ لیا جبکہ کچھ نے بائیکاٹ کیا۔ اس رویے نے مشاورت کے بہت سے مقتدر ممبران کو دل برداشتہ کر دیا اور انھوں نے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کی قیادت میں مشاورت کی رجسٹرڈ باڈی کو از سر نو فعال کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ دو سال کی متعدد میٹنگوں کے نتیجے میں یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور مئی ۲۰۲۴ میں مشاورت کی رجسٹرڈ باڈی کا انتخاب عمل میں آیا۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان صدارت کے عہدے کے خواہش مند نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی اور کو صدر منتخب کیا جائے۔ لیکن معزز ممبران کی خواہش کے آگے انھوں نے سپر ڈال دی اور اس طرح انھیں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت (رجسٹرڈ) کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس کے بعد سے رجسٹرڈ مشاورت اپنی ذمہ داریاں بخوبی ادا کر رہی ہے۔

وفیات

آہ! مولانا ثناء اللہ عمری مرحوم

محمد عمیر الصدیق ندوی

۲۶؍جولائی کو خبر ملی کہ مولانا ثنااللہ عمری، عمرِ مستعار کا قرض یا حق ادا کر کے اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ایک عالم قرآنیات، فاضل معلم، ایک خوش طرز ادیب اور صاحب دل تذکرہ نگار کے جانے کا غم سب کو ہوتا ہے، لیکن دارالمصنّفین کے نادیدہ عاشق اور ابتدائے عمر سے معارف اور اصحاب معارف سے غیر معمولی تعلق کی حیثیت سے ان کی رحلت کی خبر خاص طور پر غم و اندوہ کا ایک عالم طاری کر گئی۔ دارالمصنّفین سے ان کی محبت بلکہ شفقت اور شیفتگی کی بڑی گہری مگر خاموش داستان شاید مدتوں یاد کی جاتی رہے۔

آندھرا پردیش کے ضلع کرشنا میں خلیج بنگال کے ساحل پر مچھلی پٹنم کی خوبصورت بستی ہے، سیاحوں کے لیے کشش لیے ہوئے۔ اسی بستی کا ایک گاؤں کٹا نچور ہے، یہاں مسلمانوں کے کئی خاندان ریاست حیدرآباد دکن سے آکر آباد ہوگئے تھے۔ان ہی میں ایک خاندان کے فرزند مولوی عبدالواحد تھے، حافظ و عالم تھے، بڑے کاشتکار بھی تھے۔ مولانا ثناء اللہ ان کے بیٹے تھے۔ ان کے سن پیدائش کا علم نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ عمر آباد کے مشہور تعلیمی ادارے دارالسلام سے وہ ۱۹۶۱ء میں فارغ ہوئے، اندازہ یہی ہے کہ اس وقت وہ ۱۸-۲۰ سال کے رہے ہوں گے، یعنی ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء کے آس پاس کا زمانہ ان کی پیدائش کا ہو سکتا ہے، اس لحاظ سے عمر مستعار کی کل مدت قریب پچاسی سال کی ہوئی، لیکن عمر کی اس درازی نے وفات سے قریب ایک ہفتہ پہلے تک کم از کم گفتگو میں کسی عارضہ یا مرض کا اشارہ تک نہیں ہونے دیا۔

ان پچاسی برسوں میں شروع کے ۱۵-۱۶ سال کے سوا ان کی ساری زندگی علم و قلم کی مسلسل خدمت کا دوسرا نام ہوگئی، دارالسلام عمر آباد کے زمانۂ تعلیم سے مضمون نگاری کے ان کے شوق نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا، سیرت کے موضوع پر حیدرآباد کے ادارہ تعمیر ملت کے ایک انعامی مقابلے میں وہ کامیاب ہوئے، سیرت طیبہ پر اس پہلی تحریر کی برکت تھی کہ ان کی پاکیزہ قلمی

کاوشوں نے کتابوں کی شکل میں ایک گلستان سجادیا۔

عمر آباد سے فارغ ہوئے تو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ اسلامیات اور عصریات کا سنگم ہونا شعوری تھا یا غیر شعوری، اس سے الگ سنگم کی انفرادیت عموماً تحیر کے ساتھ تقدس کا سبب بن جاتی ہے، عمری صاحب انگریزی کے معلم بنے، مچھلی پٹنم یا مچھلی بندر کے ہندو کالج کے شعبۂ انگریزی کے استاد کی حیثیت سے وظیفہ یاب ہوئے، انگریزی میں مضامین اور کتابیں بھی لکھیں، لیکن ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قلمی سفر کے آغاز کی سعادت نے ان کو تذکرہ نگاری کے لیے ایسا خاص کیا کہ تذکرہ واجدی سے آثار رفتگاں تک قریب دس کتابوں میں سینکڑوں ایسے بزرگوں، مصلحوں، معلموں، مصنفوں، ادیبوں، شاعروں، تاجروں اور عام انسانوں کے حالات اور خدمات جو عام طور سے پردۂ خفا میں تھے اور جو ملک و ملت خصوصاً اردو دنیامیں تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو جوڑنے کے لیے بہت مفید اور کار گر مسالہ بن سکتے تھے، ان سب کو نئی زندگی بخش دی۔ آندھرا، تلنگانہ، کرناٹک، تامل ناڈ جیسے علاقے کیسے کیسے عالموں اور ادیبوں اور شاعروں کے دم سے آباد تھے، جنھوں نے علوم اسلامیہ اور اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کو بعض حیثیتوں سے شمالی ہند پر بجا طور پر تفوق اور برتری دلادی تھی۔ سب کے سوانح جمع کرنا یقیناً ایک کارنامہ ہے۔ ان کی تصنیفات میں قرآن اور دعا اور امثال القرآن اور صدائے منبر کے دو حصے بھی شامل ہیں، یہ کتابیں دراصل جامعہ دار السلام عمر آباد کے ادارہ تحقیقات اسلامی کے قیام کی برکت ہیں، وہ اس ادارہ کے پہلے ڈائریکٹر تھے۔ یہ اعزاز دیکھا جائے تو ان کے قرآنی مطالعہ اور اس ناحیہ مطالعہ کا اعزاز تھا، جس نے قرآن مجید و حدیث شریف کے تعلق سے لکھنے لکھانے کی غرض اس نیت سے وابستہ کردی تھی کہ مقصد دعوت و تبلیغ اور تذکرہ و موعظت ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی میں عمری صاحب کی آمد کو ان کے مخلص ترین رفیق مولانا حفیظ الرحمن اعظمی نے جامعہ کی نشاۃ الثانیہ کا باعث قرار دیا۔ امثال القرآن کے دیباچہ کے لیے عمری صاحب نے مولانا ضیاء الدین اصلاحی سے درخواست کی، جنھوں نے عمری صاحب کے اسلوب کی اثر انگیزی اور دل نشینی کی داد تو دی ہی، لکھا کہ ”اس موضوع پر براہ راست اردو میں یہ پہلی مبسوط اور مفید کتاب ہے“۔ صدائے منبر میں ان کے خطبات جمعہ ہیں، جو تمام تر قرآنی مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان کی علمی و دینی قدر و منزلت کے لیے یہی کتابیں کافی ہیں، لیکن عمری صاحب کا امتیاز بلکہ ان کی اصل شناخت ان کی تذکرہ نگاری ہی کہی جائے گی۔ طالب علمی کے دوسرے دور میں وہ حیدرآباد کے دائرۃ المعارف میں پروف ریڈر ہوئے اور یہیں رہ کر انھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ

تعلق اردو ادبیات سے ہوا اور اسی ماحول نے ان کو ادبی تذکرہ نگاری کا ذوق عطا کیا۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی سے پہلی ملاقات میں مولانا سعید کا کا عمری نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ دارالمصنّفین سے محبت رکھنے والے ہیں" یہ رشتۂ محبت وقت کے ساتھ مضبوط تر ہوتا گیا، ۲۰۰۶ء کے ایک خط میں مولانا اصلاحی نے لکھا کہ:

آپ جیسے مخلصین نایاب نہ ہوں تو کم یاب ضرور ہیں، وہ بھی اس دور فتن اور عہد خود غرضی میں:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

مگر پراگندہ ہونے کے بجائے آپ تو سراپا اخلاص اور مجسمہ شرافت ہیں۔

عمری صاحب نے اصلاحی صاحب کی یادوں میں ان کے دس خطوط بھی شائع کر دیے، یہ اتنے اہم ہیں کہ دارالمصنّفین کے مزاج و منہاج کو سمجھنے کے لیے آج کے مخلصین کو ان کے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

دارالمصنّفین سے محبت کا یہ عالم محض وقتی یا کسی اچانک تاثر کا نتیجہ نہیں تھا، عمری صاحب کے ذوق سلیم نے نوعمری ہی میں ان کو معارف کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں حال یہ تھا کہ معارف کی خاطر مہینے بھر کا انتظار ان کو بہت شاق گذرتا۔ انھوں نے سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم کے انتقال پر بھی بڑا پر اثر نثری مرثیہ لکھا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ دارالسلام کے بعد دارالمصنّفین کو اپنا دارالقرار بنانا چاہتے تھے، اس کے لیے انھوں نے شاہ معین الدین احمد ندوی سے خط و کتابت کی، لیکن سید صباح الدین مرحوم کا ایک خط وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رہے۔ ۱۹۶۰ء کے دارالمصنّفین کی جو مالی حالت تھی اس کی روشنی میں عمری صاحب کو چند مشورے دیے گئے، ان میں آخر میں یہ بھی تھا کہ متوقع مالی دشواریوں کے علاوہ یہاں کی زندگی بڑی راہبانہ ہے، صبر آزما، دشوار، متقشف، زندگی کی تفریحات سے بالکل الگ تھلگ۔ ان الفاظ سے عمری صاحب نے زندگی کی حقیقت کو سمجھ تو لیا لیکن مایوسی میں بھی ان کی محبت و عقیدت میں کمی نہیں آئی، کہتے رہے کہ یہ واحد اسلامی ادارہ ہے جو بالکل خاموش اور انتہائی ٹھوس علمی و دینی خدمت انجام دے رہا ہے اور روایتی اعتدال اور توازن کا سررشتہ مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔

دارالمصنّفین سے غیر معمولی محبت نے ان کے قلم کو بار بار علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادی کی یادوں کے چمن کی سیر کے لیے تیار کیا۔

مولانا دریابادی نے خاص طور پر ان کے اسلوب اور افکار کو متاثر کیا، بعضوں کی اس رائے سے وہ انکار نہیں کرتے تھے کہ اسلوب ماجدی میں وہ اپنے مسلک کے برخلاف نہایت درجہ مقلد نظر آتے ہیں، ان سے اکثر سوال کیا جاتا کہ مچھلی پٹنم کی مٹی میں اودھ کے دریاباد کی قصباتی خوشبو کس طرح سرایت کر گئی، ان کے پڑھنے والے اور یہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں، سب کا تاثر یہی ہوتا کہ ان کے قلم کی روشنائی ماجدی رنگ و مسالے سے تیار کی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تالیف دید و شنید کے مسودے کو ۲۰۲۲ء میں تیار کیا تھا، جس کا انتساب انہوں نے بشرط طباعت و اشاعت مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام کیا اور یہ مصرع بھی زیب طباعت کر دیا کہ:

ہر چہ زیشاں می رسد آخر بایشاں می رود

مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان کی عقیدت کے مرکز تھے، فکر و نظر کی مرکزیت کے ساتھ علامہ شبلی سے آزاد کا رشتہ بھی غالباً ایک بڑا سبب بنا ہو۔ انہوں نے مولانا آزاد کے بعض معرکۃ الآرا مضامین کا انگریزی ترجمہ Gems of a Genius کے نام سے کیا، ان کی کتابوں کے کچھ اور نام بھی دل چاہتا ہے کہ یہاں درج کر دیے جائیں، جیسے اسلام کی آغوش میں، بات ایک مسیحا نفس کی، کاروان حق، مجھے یاد آنے والے، نذرانہ اشک، کہکشانِ جامعہ۔

چند مہینے پہلے ان کی تازہ ترین کتاب 'چند سفروں کی داستان' کے نام سے موصول ہوئی۔ کیا خبر تھی کہ اس کے بعد سفر آخرت کا اذن ہو چکا ہے۔ تبصرہ ہونے سے پہلے یہ کتاب خود ان کے تذکرے میں بدل گئی، لیکن یہ ان کی محبتوں کے خاتمہ بالخیر ہونے کی داستان بھی سناتی رہے گی۔ ہاں اب ان کی مخصوص ارتعاشی آواز سے سماعتیں محروم ہی رہیں گی، لیکن ان ارتعاشی لہروں کے ذریعہ ان کے حوصلہ افزا کلمات اور اللہم زد فزد کا ورد جو ان کا معمول بن گیا تھا، اس کی توانائیوں کا احساس بہر حال زندہ رہے گا۔

وفات سے صرف ایک ہفتہ پہلے کی گفتگو میں تازہ معارف کے نہ ملنے کا شکوہ تھا، ساتھ ہی یہ جملہ بھی تھا کہ ادھر طبیعت کچھ نڈھال ہے، یعنی معمولی سی بیماری نے آخرِ وقت کی اداسی اور نم فضاؤں کے سکوت کے شکوے گلے کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ آخر میں ایک بات وہ جس کے ذکر سے انہوں نے منع کیا تھا، مگر اب آہستہ سے ہی سہی، محاسن رفتگاں کے ذکر میں بغیر کہے رہا بھی نہیں جاتا کہ انہوں نے اپنی محدود کمائی سے ایک خاصی رقم دارالمصنّفین کو نذر کی تھی۔ باقی ان کے علمی تحفے مثلاً نایاب شاہنامہ فردوسی وغیرہ ان کی یاد دلاتے ہی رہیں گے۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ۔

تبصرۂ کتب

حفیظ الدین احمد، تلاش و تحقیق، اطہر فاروقی، دہلی کی عمارات کے کتبوں کا اولین مخطوطہ نسخۂ حفیظ الدین احمد، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات:۲۷۶، قیمت:۱۰۰۰ روپے، سن اشاعت:۲۰۲۴ء، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲ راؤز ایونیو، نئ دہلی ۱۱۰۰۰۲، ای میل:farouqui@yahoo.com

دہلی کے عالم میں انتخاب، شہر ہونے کی بڑی وجہ یا خوبی اس کی وہ عمارتیں ہیں جو فن تعمیر کے ساتھ تعمیر کرانے والوں کے اعلیٰ و احسن ذوق کا نمونہ بن گئیں۔ ان کے لیے آثارالصنادید یعنی بزرگوں کے آثار کی تعبیر بنوانے والوں کی عظمت اور بزرگی کے مفہوم کے ساتھ عمارتوں کے تقدس کا احساس دلاتی ہے۔ اسی احساس کو عمارتوں کی طرح دوام و استحکام بخشنے میں انیسویں صدی کے اوائل کے ایک بزرگ حفیظ الدین احمد کی محنت، تلاش و جستجو کا بڑا کردار اور حصہ ہے۔ جنھوں نے اہم تاریخی عمارتوں، مقبروں اور مزاروں کے کتبات نقل کرنے اور ان کو ایک مخطوطے کی شکل میں محفوظ کر دینے کا فرض انجام دیا۔ سیر المنازل اور آثارالصنادید کا اس صنف یعنی نقل کتبات میں عام طور سے اہتمام سے ذکر ہوتا ہے لیکن زیر نظر عکسی مخطوطے نے بتایا کہ اولیت کا شرف حفیظ الدین احمد کی کاوشوں کو حاصل ہے۔ مخطوطہ کی تاریخ بجائے خود دلچسپ ہے لیکن اطہر فاروقی کے کلمات تقدیم نے جو تعارف کے عنوان سے ہیں اس کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ انھوں نے شروع ہی میں نو دریافت مخطوطہ کو اہم دستاویزی کوشش کہہ کر اس یقین کا اظہار کر دیا کہ اب دہلی کی عمارتوں کے حوالے سے لکھی جانے والی تاریخ کا شاید رخ ہی بدل جائے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ اب تو عمارتیں کیا، ان عمارتوں کو وجود میں لانے والوں ہی کی تاریخ کا رخ بدل چکا ہے۔

تعارف میں بتایا گیا کہ مخطوطہ کہاں تھا اور اب کس حالت میں ہے، کس سنہ میں تیار کیا گیا، جامع کے علاوہ کاتب کون ہیں، جامع یا مؤلف کون اور کیا ہیں اور کتبات نقل کرنے میں اصل سے کامل مطابقت کی نہایت دشوار کوشش کس درجہ کامیاب رہی۔ ان سوالوں کے علاوہ تحقیق پر مبنی

تنقید کے رویے بھی ظاہر ہوتے ہیں جیسے سیر المنازل کے مولف سنگین بیگ، نسخۂ حفیظ کے کاتب تھے لیکن انھوں نے حفیظ الدین احمد کے سرمایۂ تحقیق و جستجو کو اپنے نام سے سیر المنازل میں اتار دیا بلکہ کھلے لفظوں میں وہ سرقہ کے عمل کے مرتکب ہوئے۔ سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید کی شہرت ان کی شخصیت کی طرح ہوئی لیکن اس میں نسخۂ حفیظ کے تمام کتبے بغیر کسی حوالے یا اشارے کے جمع کر دیے گئے۔ اس کے لیے امام بخش صہبائی سے بھی فاروقی صاحب بجا طور پر ناراض ہو کر لکھتے ہیں کہ صہبائی نے پہلے اسے موجود کتبوں کو مالِ غنیمت کے طور پر استعمال کیا اور دوستی (سر سید کی) یا پیسوں کے لیے آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن تیار کیا۔ ایک اور اہم بات یہ کہی گئی ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے منشی بشیر احمد کی کتاب واقعات دار الحکومت دہلی، کتبات کے مذکورہ تینوں مجموعوں سے افضل ہے۔ مخطوطۂ حفیظ سے اس درجہ دلچسپی کی وجہ پروفیسر شریف حسین قاسمی کی ایک تحریر ہوئی اور اسی نے فاروقی صاحب کو برٹش لائبریری سے اس نادر مخطوطہ کے حصول کے لیے آمادۂ سفر لندن کیا۔ جہاں سب سے زیادہ تعاون ان کو صبور قدوائی سے ملا بلکہ اصل سے عکس کا حصول ان ہی سے ممکن ہوا۔ صبور قدوائی کو ایک مشہور خانوادے کا چشم و چراغ بتایا گیا۔ اچھا ہوتا کہ ان کے تعارف میں ان کے والد پروفیسر عبد الرحیم قدوائی اور پرنانا مولانا عبد الماجد دریابادی کے ناموں کی صراحت آجاتی۔ کتبات کے ترجمہ اور ان پر حواشی اور تدوین کا حق، فاروقی صاحب کی نظر میں پروفیسر شریف حسین قاسمی کو ہے۔ خدا کرے کہ یہ حق جلد سے جلد ادا ہو اور پھر اس کی روشنی میں دہلی کی تاریخ کے مطالعہ کا بقول فاروقی صاحب، رخ بدل جائے۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، متاعِ فقیر، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۷۰۴، قیمت: ۱۶۰۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، موبائل: ۹۸۳۹۵۸۲۲۱۱ اور مکتبہ دینی تعلیمی کونسل، عارف آشیانہ، چوک، لکھنؤ۳ اور الفرقان بک ڈپو ۳۱/ ۱۱۴ نظیر آباد، لکھنؤ۱۸

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کی شخصیت اور ان کی تالیفات و تصنیفات کے ذکر سے معارف کے یہ صفحات وقتاً فوقتاً شاد آباد رہتے ہیں۔ اب ان کے مقالات و مضامین کا یہ ضخیم مجموعہ گویا ان کی اب تک کی تحریری زندگی کا مکمل سرمایہ ہے۔ سرمایہ کو فقیر کی متاع کی تعبیر، ذہن کو علامہ اقبال کے فلسفۂ فقر کی جانب منتقل کر دیتی ہے اور اسی فقر سے فقیر کے درجہ کا تعین بھی آسان ہو جاتا ہے،

فقر اگر ایسا ہو کہ اس سے مسکینی ودلگیری کی جگہ اسرار جہانگیری کھلنے لگیں اور یہ اسرار کچھ اور نہیں روح قرآنی کا ظہور ہوں تو صحیح یہی ہے کہ ایسا فقر، ہزاروں مقام کی دولت کا نشان بن جاتا ہے۔ اس نسخۂ عثمانی میں اسلامیات، شخصیات، سیاسیات کے ساتھ اردو اور مسلم یونیورسٹی اور دیگر عصری موضوعات پر مطالعے، خیالات اور نظریات سے ذہن وقلب کو جو سیرابی اور سرشاری کی لذت ملتی ہے وہ واقعی کسی فقیر علم وادب کے کشکول ہی کی دین کہی جاسکتی ہے۔ اسلامیات میں عبادات کے تصور، عشق محمدیؐ کی دولت لازوال جیسے موضوعات کے ساتھ، روزہ، زکوٰۃ، جہاد اور ظہور قدسی پر تحریریں ہیں۔ مگر اصل لطف تو حصہ شخصیات کی سیر میں ہے جہاں علامہ شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ مولانا منظور نعمانی، قاری صدیق باندوی سے لے کر عثمانی صاحب کے بزرگوں، استادوں، دوستوں اور رشتہ داروں کی یادوں کی کہکشاں سجی نظر آتی ہے۔ ہر فرد گویا مہ پارہ وسیارہ بن کر قاری کے ذہنی وقلبی آفاق کو روشن کرتا جاتا ہے۔

علامہ شبلی کی شخصیت کے تخلیقی عناصر میں عثمانی صاحب کے جملوں کی رعنائی، پروفیسر خورشید الاسلام کی یاد لانے لگتی ہے۔ جیسے "شبلی نے دیوبند کے ذریعہ علی گڑھ کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور علی گڑھ سے انھوں نے دیوبند کو سمجھنے کی۔ مولانا شبلی کا آخری کارنامہ ندوۃ العلماء ہے لیکن خود ان کی شخصی تعمیر میں ندوہ کا کوئی حصہ نہیں۔ شبلی کی شخصیت کے تخلیقی عناصر میں ان کے جمالیاتی شعور کا دخل بہت بڑا ہے جس نے ان کے اندر سوزو گداز اور کیف ومستی پیدا کردی"۔ مولانا محمد علی جوہر پر ان کی تحریر بھی کچھ خاص ہے۔ ایک تو عنوان ہی بلا کا ہے کہ: آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب۔ اس احساس کا اظہار کسی فرض سے کم نہیں کہ ہندوستان کی وہ تاریخ جو خون جگر سے لکھی گئی وہ مولانا محمد علی جوہر کے ذکر کے بغیر رنگین نہیں ہوسکتی۔ ایک اور مضمون جو پہلے مضمون کا ضمیمہ یا تتمہ ہے وہ علی برادران کے عنوان سے ہے، یہاں بھی ایک جملہ، عنوان کیا، ترجمان حقیقت بن گیا ہے کہ دیوانے بھی فرزانے بھی۔

مولانا آزاد ہوں یا قاضی عدیل عباسی، مولانا عبداللہ عباس ہوں یا مولانا حمزہ حسنی ہر شخصیت کے جوہر کی یافت اور اس سے قاری کے لیے نئے جہانوں کی دریافت میں یہ تحریریں لکھنے والے کے کمال فن کی خود گواہی دیتی جاتی ہیں۔ اتنی ضخیم اور متنوع موضوعات ووسائل پر محیط کتاب

کا سرسری جائزہ بھی، اختصار کی حدوں سے تجاوز ہی ہوگا۔ مقصد اگر ادبی لطف و لذت، علمی گہرائی وگیرائی اور روحانی سکون و طمانینت کا حصول ہے تو یہ متاع فقیر اصلاً وہ سفینہ فقیر ہے جو راہبانہ سکون پرستی سے بیزار اور ہمیشہ موج بداماں رہتا ہے:

فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی (ع۔ص)

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، جہات قرآنیات، (مرتب) رفیق احمد سلفی، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۳۷۶، ملنے کا پتہ: خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۷۰، موبائل نمبر و ای میل: درج نہیں۔

مصنّف کتاب کی فکر میں اعتدال، رائے میں معروضیت، اسلوب میں متانت پائی جاتی ہے۔ اردو اور انگریزی میں قرآنیات بالخصوص قرآن کے انگریزی ترجموں پر ان کی خاص نظر ہے۔ زیر نظر تصنیف اکیس تنقیدی مقالات اور تبصروں پر مشتمل ہے جن میں بعض ترجمے ہیں۔ مختلف جہتوں سے قرآنی علوم و معارف بالخصوص بعض اہم انگریزی تراجم کا جائزہ باریک بینی سے لیا گیا ہے۔ قرآنیات پر ان کے غور و فکر کا ایک پہلو قرآن میں حقیقی تصور نیکی کی الگ نقطۂ نظر سے وضاحت بھی ہے۔ قرآن و توریت میں قصۂ یوسف کا موازنہ بھی بڑی خوبی سے کیا گیا ہے جس سے توریت میں تحریف اور قرآن مجید کے توریت سے ماخوذ ہونے کے الزام کی تردید سامنے آئی ہے۔ قصۂ یوسف اور سیرت محمدیؐ کے مشترک اقدار اور اس کے دینی، روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کی نشاندہی اس پر مستزاد۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی انگریزی تصنیف پر تبصرے کے دوران قرآن مجید کی استنادی و دستاویزی حیثیت اور جمع و ترتیب پر تاریخی اور محققانہ گفتگو کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن، نزول کے دن سے آج تک اپنی اصل شکل میں محفوظ اور صحیح سالم ہے۔ ایک مضمون میں قرآن مجید کے استناد کے بارے میں مستشرقین کے آثاریات پر مبنی موقف کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مستشرقین کی ضد ہے کہ مسلمانوں کی وہی چیز قبول کی جائے گی جس کا ثبوت آثار قدیمہ سے ملتا ہو۔ چنانچہ مصنّف نے خلیفہ عبدالملک کے کندہ کرائے گئے قرآنی آیات پر مشتمل کتبات، سکوں اور بعض قدیم زائرین کے سفرناموں اور کتابوں میں دیواروں اور دروازوں پر نقش آیتوں کے متعلق تحریروں کو بہ طور ثبوت پیش کیا ہے۔ اس طرح مغربی اسکالرز کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب اس میں آگیا ہے۔ انگریزی تراجم قرآن میں پکتھال، عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر تقی الدین

ہلالی اور محمد محسن خاں کے مشترک اور حال ہی میں شائع شدہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے ترجموں کا مفصل اور دقت نظری سے جائزہ لے کر ان کی خصوصیات اور بعض میں درآئی علمی، تحقیقی اور فکری غلطیوں اور کمیوں کی نشاندہی کی ہے [1]۔ پکتھال کے ترجمے کو معیاری، متن قرآن سے بہت قریب اور صحیح انگریزی ترجمہ بتایا ہے۔(ص ۱۰۲) عبداللہ یوسف علی کے پہلے ترجمے کو گمراہ کن بتاتے ہوئے سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں اس کے عواقب پر مناسب گفتگو کی ہے لیکن دارالافتاء سعودی عرب سے شائع شدہ ایڈیشن کو باعث اطمئنان اس لیے قرار دیا ہے کہ یہ نیا ایڈیشن علی کی علامتی تعبیر اور تشریح سے بڑی حد تک پاک ہے(ص۱۱۵) مولانا عبد الماجد دریابادی کے انگریزی ترجمے کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان کا انگریزی ترجمۂ قرآن اپنے حکیمانہ حواشی کی مدد سے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے لیے تریاق ثابت ہوا"(ص۱۳۸) ڈاکٹر ظفر الاسلام کے ترجمۂ قرآن کے ناقدانہ جائزے میں یہ لکھا ہے کہ "بعض اسقام سے قطع نظر اس ترجمے سے قرآنیات کے مزید مطالعے اور تحقیق کے باب ضرور واہوئے ہیں.....انگریزی زبان وبیان کے حسن، متن کے ترجمے کی صحت اور تفسیر بالماثور کی روایت کی بڑی حد تک ترجمانی اس ترجمۂ قرآن کے محاسن ہیں۔(۱۶۳۔۱۶۴)۔ایک مضمون میں ۱۶۴۹ء سے ۲۰۰۰ء تک کل ۵۰ مکمل انگریزی تراجم قرآن (ص ۱۲۵) کا انکشاف شیدایان قرآن کے لیے کیا کم تھا کہ ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۹ء کے دوران مختلف مکاتب فکر کے کل ایک درجن سے زیادہ اور ۱۹۹۱ سے ۲۰۲۰ء تک خواتین کے کل ۱۳ تراجم قرآن کا تعارف بھی کرادیا۔ان کی یہ اطلاع بھی کتاب میں موجود ہے کہ ۲۰۲۳ء تک تقریباً ۱۰۰ اتراجم مسلمانوں کے ذریعے منظر عام پر آچکے ہیں(ص۱۷۲)۔اس سے مصنّف کی تسلسل کے ساتھ تراجم قرآن سے واقفیت اوران پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک مضمون میں ان ترجموں سے استفادہ کا طریقہ بھی بتایا گیاہے۔کتاب کے بیشتر مضامین متعدد اعتبار سے انفرادیت کے حامل

---

[1] ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے پروفیسر قدوائی کی اس طرح کی اکثر آراء کو تسلیم نہیں کیا ہے۔پروفیسر قدوائی نے ان آراء کا اظہار مجلہ تحقیقات اسلامی (اپریل۔جون ۲۰۲۴ء) میں شائع ہونے والے اپنے ایک تبصرے میں کیا تھا۔ڈاکٹر ظفر الاسلام نے مذکورہ مجلہ کے اگلے ہی شمارے میں اپنے موقف کی وضاحت کردی تھی لیکن پھر بھی ان بے سر و پیر آراء کو بعض لوگ دوسرے موقف کو بیان کیے بغیر دہرا رہے ہیں۔پکتھال کے ترجمے کو معیاری اور متن قرآنی سے بہت قریب قرار دینا بھی ایک بھدا مذاق ہے۔عربی زبان جانے بغیر اس طرح کی جرأت کرنے سے ایسے ہی نتائج نکلتے ہیں۔صرف رواں انگریزی پکتھال کے ترجمے کو معیاری نہیں بنا سکتی ہے۔مترجم (پکتھال) صرف دارجہ (بازاری یا عوامی) عربی جانتے تھے اور ان کے قدرداں (قدوائی) اتنی عربی بھی نہیں جانتے (مدیر)۔

اور لائق مطالعہ ہیں۔ بایں طور مصنّف کے اس دعوی کہ "قرآنیات پر یہ تصنیف ان معروف روایتی کتب سے مختلف ہے جن میں کلام اللہ کی کسی نقطۂ نظر سے تعبیر و تشریح کی جاتی ہے" پر یقین کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ بعض ضروری مقامات پر حوالے رہ گئے ہیں۔ مثلاص ۲۰ پر قرطبی کی تفسیر کا حوالہ نہیں ہے۔ ص ۲۹ پر ہے کہ انجمن فلاح دارین، لکھنؤ کی خدمات کا تجزیہ ایک امریکی فاضل نے اپنے تحقیقی مقالے میں کیا ہے مگر یہاں بھی حوالہ مفقود ہے۔ ص ۴۰ پر معذوروں کے ساتھ افلاطون وارسطو کے جارحانہ رویے کا ذکر ہے لیکن ماخذ کا پتہ نہیں۔ پروف پر بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ مرتب قابل مبارک ہیں کہ ان کی توجہ وترتیب سے یہ علمی کاوش منظر عام پر آئی۔ (کلیم صفات اصلاحی)

قاضی عیاض اندلسی، کتاب شفا در حقوق مصطفیٰؐ، مترجم محمد علاء الدین، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۶۱۶، ملنے کا پتہ: مجلس صحافت و نشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰/ روپئے۔ موبائل نمبر: ۹۸۲۱۴۲۴۱۲۷۔

سیرت کے موضوع پر قاضی عیاض اندلسی کی شہرۂ آفاق ضخیم تصنیف الشفاء کو ادبی لحاظ سے خاص مقام وامتیاز حاصل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ دنیا کے مشہور کتب خانوں میں اس کے مخطوطہ نسخوں اور اس کی شرحوں سے ہوتا ہے جن میں سے بعض کا ذکر مترجم نے اپنے مقدمے میں کیا بھی ہے۔ اردو شائقین سیرت کی اس سے دلچسپی کم نہیں رہی۔ چنانچہ اس کے اوصاف و خصائص پر بڑے اہم اور قابل قدر آراء و خیالات اور کتب سیرت میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ اس سے قبل کتاب الشفاء کے متعدد اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر ترجمہ چالیس سال قبل کیا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے۔ پیش لفظ مولانا عمیر الصدیق ندوی کے قلم سے ہے۔ ترجمہ بلاشبہ سلیس، ادبی اور مصنّف کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے قریب دکھائی دیتا ہے۔ مبہم عبارتوں کی بریکٹ میں توضیح اور ہر باب کے آخر میں قیمتی حواشی نے کتاب کی کشش کو دوبالا کر دیا ہے۔ البتہ ترجمے کے دوران "تشکیل جدید" میں جو ذہنی وفکری جولانی دکھائی گئی ہے ضروری نہیں ہے کہ ہر مستفید و قاری اس کو پسند کرے۔ ایک طرف علامہ مقریزی کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ شیریں بیانی وروانی کی وجہ سے اس کتاب کی دھوم مچ گئی اور عرب و عجم اس پر فریفتہ تھے اور دوسری طرف اس عہد کے اسلوب کو "غیر فطری" قرار دیا گیا ہے اور اس عہد

کے اسلوب کو آج کے رواں اسلوب میں منتقل کرنے کا کام مشکل بتایا گیا ہے (ص ۲۵) اس کے باوجود حیرت ہے کہ لائبیریا کی دعوتی و تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ محض چھ مہینے میں اس دشوار گذار گھاٹی کو مترجم نے کیسے سر کرلیا۔

مصنّف نے کتاب کے مقدمے میں ابواب وفصول کا تذکرہ بعنوان کیا تھا۔ مترجم نے اس حصے کی بھرپائی فہرست سے کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس کی بعض ضروری عبارتوں کا ترجمہ غیر ضروری سمجھ کر قلم انداز کردیا ہے۔ ص ۵۰ پر ترجمانی کی گئی ہے کہ "اللہ نے ہر عیب سے آپؐ کو پاک بتایا" تاہم اصل عبارت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے رسول اللہ کا بے عیب ہونا ظاہر ہو۔ بے عیبی تو الٰہی صفت ہے۔ مترجم نے وجہ تصنیف پر مشتمل اس جملے "فانک کررت علیّ السؤال فی مجموع یتضمن التعریف بقدرالمصطفی علیہ الصلاۃ و السلام ومایجب لہ من توقیر واکرام" کی ترجمانی اس طرح کی ہے "سائل (طالب حق) کے باربار اصرار وسوال سے کہ ایک ایسی کتاب منظر عام پر لائی جائے جو فضائل مصطفی اور شمائل نبویہ کی جامع ہو، جس میں بتایا گیا ہو کہ آپ کی تعظیم وتوقیر کے احکام کیا ہیں" (ص ۳۶) اسی عبارت کا ترجمہ دوسرے مترجم نے یوں کیا ہے۔ "احباب نے مجھ سے باربار فرمائش کی ہے کہ ایک ایسی کتاب ترتیب دوں جو سرور کون ومکاں، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیؐ کے حقوق اور آپؐ کی تعظیم وتکریم کے وجوب پر مشتمل ہو"۔

اس کا پہلا ترجمہ "شمیم الریاض" ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ایک ایڈیشن شمع بک ایجنسی، لاہور نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا ہے۔ مولانا غلام معین الدین نعیمی کا کیا ہوا ترجمہ ادارہ سواد اعظم، لاہور نے دو جلدوں میں چھاپا ہے۔ ایک ترجمہ دو جلدوں میں مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ لاہور نے ۱۹۹۷ء میں کتاب الشفا بہ تعریف حقوق المصطفی کے نام سے شائع کیا ہے۔ پہلی جلد کے مترجم مولانا عبد الحکیم اختر شاہجہاں پوری اور دوسری جلد کے مولانا محمد اطہر نعیمی ہیں۔ ان ترجموں میں اصل کی رعایت کی گئی ہے۔ پتہ نہیں فاضل مترجم نے اشاعت سے قبل ان مطبوعہ ترجموں کو بھی پیش نظر رکھا تھا یا نہیں۔ بہرحال طالبان علوم سیرت کے لیے یہ علمی خدمت کسی بیش قیمت تحفے سے کم نہیں۔

(ک۔ص اصلاحی)

سہولت کے لیے

خالد ندیم

چلیں ابا!
تمہیں ہم چھوڑ آتے ہیں
جہاں تم کو تمہاری عمر ہی کے لوگ مل جائیں
جہاں باتیں سنانے اور سننے میں کوئی خدشہ نہ حائل ہو
جہاں تم کو ہنسی کی بات پر ہنسنے کا موقع ہو
جہاں تم تاش یا لڈو کبھی جو کھیلنا چاہو تو ساتھی بھی میسر ہوں
جہاں اخبار پڑھنے پر کوئی حیراں نہ ہوتا ہو
سیاست کی، ثقافت کی، عقائد کی سبھی باتیں بھی ہوتی ہوں
جہاں کپڑوں کی سلوٹ سے کوئی الجھن نہ ہوتی ہو
جہاں جوتوں کی پالش پر نہ کوئی بات کرتا ہو
جہاں بالوں کے الجھاو سے اَوروں کی جبینوں پر کہیں شکنیں نہ پڑتی ہوں
جہاں داڑھی پہ کھانے کے اگر ریزے بھی رہ جائیں
کنکھیوں سے تمہیں کوئی نہ تکتا ہو
لطیفے بھی نہ بنتے ہیں
جہاں مہماں کے آنے سے تمہیں اٹھنے کی زحمت ہو نہ جانے کا اشارہ ہو
تمہارے لڑکھڑانے سے نہ دیواریں پریشاں ہوں
نہ بچوں کی شرارت ہی تمہیں بیزار کرتی ہو
نہ موسیقی کی آوازیں فشارِ خوں بڑھاتی ہوں
نہ شاپنگ کی فراوانی سے دھڑکن تیز ہوتی ہو
دواؤں کی ضرورت پر کسی کا منہ نہ بنتا ہو
نماز و روزہ و صدقہ نہ ہونے سے تمہیں کوئی پریشانی نہ آتی ہو
چلیں ابا!
تمہیں ہم چھوڑ آتے ہیں
کہ اَب اس عمر میں تم کو سہولت کی ضرورت ہے

رسید کتب موصولہ

ڈاکٹر محمد فرمان ندوی، بالاسلام اعزنا اللہ!(عربی): ندوی بک ڈپو، ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ، صفحات:۱۴۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۱۲۰روپے، موبائل نمبر:۸۷۰۷۴۸۸۴۲۴

محمد مستقیم محتشم ندوی، بھٹکل کے سفر نامے: مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ، صفحات:۲۴۸، سالِ اشاعت: ۲۰۱۲ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: درج نہیں

مولانا محمد ادریس نگرامی، ڈاکٹر عمار انیس نگرامی (تحقیق واضافہ)، تذکرہ علمائے حال: مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، صفحات:۱۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

مولانا محمد ثناء اللہ عمری، چند سفروں کی داستان: مکتبہ الادیب، محمد بن یوسف السورتی، سامرود، سورت، گجرات، صفحات:۲۱۶، سالِ اشاعت:۲۰۲۵ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۳۱۳۰۰۷۷۳۶

حافظ محمد امتیاز رحمانی (مرتب)، خطباتِ رحمانی: دارالاشاعت خانقاہِ مونگیر، صفحات:۱۶۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

شمیم طارق، عارفانہ اور متصوفانہ اشعار: ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، کوچہ چیلان، دریاگنج، نئی دہلی، صفحات: ۱۴۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت:۲۵۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۱۰۷۸۴۵۴۹

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی، فرسان العلم والادب (عربی): دارالرشید، خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ، صفحات:۲۳۲، سالِ اشاعت:۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۲۲۹۴۰۹۷

سید علی رضا ایس ایم بھٹکلی ندوی، مظفر کولا حیات وخدمات: نونہال سنٹرل اسکول بھٹکل، کرناٹک، صفحات:۳۲۰، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: درج نہیں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، نامورانِ اعظم گڑھ: شائستہ منزل، پورہ غلامی عقب آواس وکاس، اعظم گڑھ، صفحات:۴۶۴، سالِ اشاعت:۲۰۲۵ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵

عتیق احمد بستوی، ہوا کے دوش پر: مکتبہ احسان، لکھنؤ، صفحات:۳۱۲، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۳۰۰ روپے، موبائل نمبر:۹۸۳۹۷۷۶۰۳۸

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

SEPT 2025 Vol- 212(09) ISSN 0974-7346 Ma arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org